Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

سہ ماہی

زبان و بیان

جموں کشمیر

(گروہی سروکار سے ماورا ایک ادبی دستاویز)

جلد:1، شمارہ:4　　اپریل تا جون 2025

بلراج بخشی نمبر

سرپرست

ڈاکٹر شریبہ بخشی

مجلس مشاورت

نور شاہ، پرتپال سنگھ بیتاب، وحشی سعید، پروفیسر قدوس جاوید، چندر بھان خیال، پروفیسر روبینہ شبنم، پروفیسر زین العبا، ڈاکٹر ریاض توحیدی

مجلس ادارت

ڈاکٹر شاہد جمیل، ڈاکٹر نصیب علی، ڈاکٹر شمشیر سنگھ، ڈاکٹر ژلفی رام

مدیر

ڈاکٹر جگ موہن سنگھ

معاونین

شبیر احمد، نعیم یاد، رنکو کول

☆ **قیمت:** فی شمارہ : -/300 سالانہ : -/1200 روپے (مع ڈاک خرچ)

☆ مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ سبھی قانونی چارہ جوئی صرف جموں کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

☆ پرنٹر، پبلشر اور پروپرائیٹر، ڈاکٹر جگ موہن سنگھ نے میزان سروسز، سرینگر، جموں کشمیر سے چھپوا کر کڈھار (دھندل)، کاستی گڑھ (سراز)، ڈوڈہ، جموں کشمیر، پن-182147 سے جاری کیا۔

☆ **مراسلت:** ڈاکٹر جگ موہن سنگھ، وارڈ نمبر: 5، ہاؤس نمبر: 326 باڑھیاں، اُدھم پور، جموں کشمیر، پن-182101

موبائل نمبر: 7889762542

ای میل: zubaanobayaan4@gmail.com

Published From:
Kuddhar, Dhandal, Tehsil Kastigarh (Saraz), District Doda, Jammu Kashmir (UT)
Pin Code : 182147

Postal Address:
Ward No. 5, H.No. 326, Barrian, Udhampur, Jammu Kashmir (UT)
Pin Code : 182101
Editor's Mob.No: 7889762542
E-mail Id:
zubaanobayaan4@gmail.com
jugmohansingh04@gmail.com

Bank Details:
Jammu & Kashmir Bank, Domana, Jammu
Saving **A/C No. 070604150004952,**
IFSC CODE: JAKA0DOMANA

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

فہرست

اداریہ : ڈاکٹر جگ موہن سنگھ ۳

کوائف

بلراج بخشی : ادارہ ۴

مضامین

بلراج بخشی: اپنی شرطوں کا شاعر : پروفیسر قدوس جاوید ۵

بلراج بخشی کی کہانیاں : پروفیسر علی احمد فاطمی ۱۰

بلراج بخشی اور 'ایک بوند زندگی' : دیپک بدکی ۱۵

بلراج بخشی اور ان کے افسانے : ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی ۱۹

بلراج بخشی کا فکری و فنی کینوس : ڈاکٹر مشتاق صدف ۲۳

بلراج بخشی کے شعری رویّے : ڈاکٹر الطاف انجم ۲۵

بلراج بخشی کی رنگ برنگی کہانیاں: ڈاکٹر ریاض توحیدی ۲۸

بلراج بخشی کی شاعری : رویندر جوگلیکر ۳۲

تجزیے

افسانہ 'فیصلہ' : ڈاکٹر شاہد جمیل ۳۵

افسانہ 'ایک بوند زندگی' : پرویز مانوس ۳۸

افسانہ 'زچ' : نعیم یاد ۴۰

ڈراما 'قانون شکن' : ڈاکٹر محی الدین زور ۴۲

بلراج بخشی کی تخلیقات

میرا تخلیقی سفر : بلراج بخشی ۴۵

حادثہ (افسانہ) : بلراج بخشی ۴۸

زندہ آدمی (افسانہ) : بلراج بخشی ۵۲

سقوط (افسانہ) : بلراج بخشی ۵۹

روگ (افسانہ: ڈوگری سے اردو ترجمہ) : بلراج بخشی ۶۴

ماتسو (افسانہ: ڈوگری سے اردو ترجمہ) : بلراج بخشی ۶۷

ڈوگری پر عربی اور فارسی کے اثرات (مضمون) : بلراج بخشی ۷۱

انجمن ستائشِ باہم (کالم) : بلراج بخشی ۷۸

اداریہ 'زبان و بیان' شمارہ-۱ : بلراج بخشی ۸۱

اداریہ 'زبان و بیان' شمارہ-۲ : بلراج بخشی ۸۲

اداریہ 'زبان و بیان' شمارہ-۳ : بلراج بخشی ۸۳

غزلیں : بلراج بخشی ۸۵

نظمیں : بلراج بخشی ۸۷

تبصرے

'آسانیات' : ڈاکٹر وصی بختیاری ۹۰

'ایک بوند زندگی' : ڈاکٹر جگ موہن سنگھ ۹۱

'مٹی کا موسم' : ڈاکٹر جگ موہن سنگھ ۹۳

مشاہیر ادب کے تاثرات ۹۵-۹۶

اقبال مجید، نند کشور وِکرم، کرشن کمار طور، نور شاہ، وحشی سعید، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر علی احمد فاطمی، چندر بھان خیال، پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر مولا بخش، خالد حسین، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، پروفیسر روبینہ شبنم، آنند سروپ انجم

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

اداریہ

تجدیدِ اشاعت 'زبان و بیان'، جموں کشمیر

معیاری ادبی رسائل کی اشاعت کا طویل عرصے تک جاری رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ درپیش سنگین مسائل کے سبب ان کی تعدادِ اشاعت اتنی رہ گئی ہے کہ اُنھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ بیشتر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے سربراہان اشاعتی منصوبوں پر ایمانداری سے عمل نہیں کرتے۔ لہٰذا اُن کی خانہ پُری کا منفی اثر رسالے کے اشاعتی وقفے اور معیار پر پڑتا ہے۔ خدمتِ ادب کے شوق و جنون کے زیرِ اثر ذاتی اخراجات سے جاری رسائل کے مدیران مسلسل مالی خسارے کو برداشت نہیں کر پاتے۔ نیز اِس سچ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بیشتر نامور قلمکار برائے اشاعت غیر مطبوعہ تحریریں ارسال نہیں کرتے اور اعزازی کاپی موصول ہونے پر اپنے تاثرات بھی رقم نہیں کرتے۔ بیشتر قارئین رسالے خرید کر نہیں پڑھتے۔ مبتدی تخلیق کار اپنی ناپختہ تخلیق ارسال کر کے فوری اشاعت کے لئے مدیر کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ سوشل میڈیا نے قارئین کی ایک بڑی تعداد کو ناظرین بنا دیا ہے۔ ڈاک خرچ بھی ادارے کو ادا کرنا پڑتا ہے، جو مدیران کے لیے اب ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے۔ محبِ اردو مدیران تخلیقی تعاون کرنے والے چند تخلیق کاروں، قارئین اور درجن بھر سالانہ خریداروں کے بل بوتے پر رسالے کو عرصۂ دراز تک جاری نہیں رکھ سکتے۔ بلاشبہ یہ صورتحال حوصلہ شکن ہے۔ اِس کے باوجود پُرعزم مدیران اپنے لہو سے شمعِ اشاعت کو روشن رکھتے اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ تخلیقات سے رسالے کے معیار و وقار کو قائم رکھنے کی سعی کرتے ہیں۔

نامور افسانہ نگار و شاعر اور بانی مدیر سہ ماہی 'زبان و بیان'، بلراج بخشی کو زندگی نے مزید مہلت نہیں دی۔ موصوف 'زبان و بیان' رسالے کے فقط تین شمارے ہی منظرِ عام پر لا سکے تھے۔ بلراج بخشی مرحوم کے ساتھ میرے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ اُنھوں نے تاحیات ذاتی اخراجات سے 'زبان و بیان' کو جاری رکھا تھا کیوں کہ اس سے ان کا رشتہ بیحد جذباتی تھا۔ لہٰذا بند اشاعتی سلسلے کو میں نئے جوش و خروش کے ساتھ جاری کر کے ان کے ادھورے خواب میں رنگ و نور بھرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بلراج بخشی کی صاحبزادی، ڈاکٹر شریہ بخشی کی سرپرستی کا عہد اور ہم عصر ادبی شخصیات کی معاونت کی یقین دہانی کی بنیاد پر مجھے اُمید ہے کہ یہ رسالہ طویل عرصے تک جاری رہے گا۔ میری یہ بھی کوشش ہوگی کہ مثالی ایڈیٹر بلراج بخشی کے نقشِ قدم پر چلوں۔ تجدیدِ اشاعت کے لئے مناسب سمجھا کہ چوتھا شمارہ بطور خراجِ عقیدت 'بلراج بخشی نمبر' پیش کیا جائے۔ اِس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ موصوف کی چیدہ تخلیقات اور متفرق موضوعات پر یکجا کئے گئے مضامین سے قارئین اور ریسرچ اسکالرز مستفیض ہوں گے۔

میں رسالے کی سرپرست ڈاکٹر شریہ بخشی، مجلس مشاورت اور مجلس ادارت کی معزز ادبی شخصیات، رسالے کے معاونین نیز اس شمارے میں شامل تخلیق کاروں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی معاونت سے یادگار 'بلراج بخشی نمبر' پیش کر سکا۔ میں ڈاکٹر شاہد جمیل صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ روزِ اوّل ہی سے ادارتی عمل میں ساتھ ساتھ رہے۔

آخر میں یہ التماس ہے کہ قلم کار حضرات اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات سے رسالے کے معیار و وقار میں چار چاند لگانے میں ہماری معاونت کریں اور قارئین بھی اپنی گرانقدر آرا سے نوازیں۔

ڈاکٹر جگ موہن سنگھ

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

کوائف بلراج بخشی

اصل نام: بلراج کمار بخشی
قلمی نام: بلراج بخشی
والد کا نام: کرپارام بخشی (پیشہ: محکمہ پولیس میں سب انسپکٹر)
والدہ کا نام: رام پیاری شرما (پیشہ: محکمہ تعلیم میں استانی)
بیوی کا نام: ریکھا بخشی
اولادیں: چار بیٹیاں (سونم بخشی، شیرون بخشی، ڈاکٹر شریہ بخشی اور ایڈوکیٹ اوشین بخشی)
سن پیدائش: 10 دسمبر 1949 (فوجی کیمپ، نگروٹہ، نزد جموں)
تعلیم: بی ایس سی
مستقل سکونت: آدرش کالونی، اڈھمپور (جموں کشمیر یوٹی)
وطن مالوف: پاکستان کے گاؤں پھگوائی، تحصیل حویلی، ضلع پونچھ
ادبی زندگی کا آغاز: شاعری سے (مقامی اخبارات کے علاوہ ماہنامہ ’تحریک‘ اور ماہنامہ ’شاعر‘ میں چھپتے رہے)
پہلی کہانی: مشین کا پرزہ (۱۹٦٦ء ہفتہ وار ’رفتار‘)
دوسری کہانی: چاندی کا دھوا (کالج کی تعلیم کے دوران۔ ’شاعر‘ ممبئی ۱۹٦۹ء)
صنفِ ادب: شاعری (غزل، نظم، مرثیہ، گیت)، افسانہ، تحقیق و تنقید اور صحافت
ذریعہ معاش: صحافت، دوردرشن کے لیے رائٹنگ، پروڈکشن، ڈائریکشن
زبان کی مہارت: انگریزی، اردو، ہندی، ڈوگری اور پہاڑی

تصانیف وتالیفات:

۱۔ ایک بوند زندگی (افسانوی مجموعہ) ۲۰۱۴ء
۲۔ آسانیات (دو جلدیں) ۲۱-۲۰۲۰ء
۳۔ مٹی کے موسم (شعری مجموعہ) ۲۰۲۱ء
۴۔ قیدی ((ناول۔ ڈوگری سے اردو میں ترجمہ) ۲۰۱۵ء

صحافت:

۱۔ انگریزی روزنامہ STATE TIMES کا خصوصی نامہ نگار اور نارتھ لائنز، انگریزی، جموں کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر
۲۔ روزنامہ ہمالین میل، ایکسلیئر، کشمیر ٹائمز، ہند سماچار، پنجاب کیسری، جگبانی میں تعاون
۳۔ پاکیزہ اردو میں ریڈیو کشمیر سری نگر کے لیے ’آج کی بات‘ کی ۲۰ سے زیادہ اقساط کی تحقیق اور اسکرپٹ۔
۴۔ ریڈیو کشمیر اور دوردرشن کے لیے متعدد مواقع پر جموں وکشمیر مقننہ میں کارروائی کا احاطہ کیا۔
۵۔ ادھم پور سے ۱۹۷۲ سے ۱۹۸۰ تک ’وقار اردو ویکلی‘ کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر رہے۔
٦۔ ادبی رسالہ سہ ماہی ’زبان وبیان‘ ۲۰۲۱ء میں جاری کیا۔

انعامات واعزازات:

۱۔ ممبر، حکومت جموں وکشمیر ریاستی کونسل برائے فروغ زبان اردو (SCPUL)
۲۔ مرکزی وزارت ثقافت نے سال ۰۸-۲۰۰۷ سے اردو میں 2.88 لاکھ روپے کا فیلوشپ ایوارڈ
۳۔ افسانوں کا مجموعہ ’ایک بوند زندگی‘ پر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ اور بہار اردو اکادمی، پٹنہ سے ایوارڈ
۴۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۱۷ء میں حکومت جموں وکشمیر کی جانب سے ۵۱ ہزار روپے کا ریاستی ایوارڈ
۵۔ جموں یونیورسٹی سے ایم اردو (پروفیشنل) ایوارڈ برائے سال ۰۴-۲۰۰۳
٦۔ متعدد کل ہند مشاعروں، سیمیناروں اور ورکشاپس میں شرکت۔
۷۔ مصنفین کے تخلیقی پینل کے رکن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (منسٹری آف ایچ آر ڈی)، نئی دہلی، سال ۲۰۱۸ سے۔
۸۔ سال ۲۰۱۹ کے لیے ساہتیہ اکادمی کے بال ساہتیہ پرسکار اور سال ۲۰۱۷ میں ترجمہ ایوارڈ کے لیے جیوری کے رکن۔
۹۔ اردو زبان وادب میں بلراج کی خدمات پر جموں یونیورسٹی نے دو ایم فلز کروائی ہیں۔
۱۰۔ سال ۲۰۱۴ اور سال ۲۰۱۷ کے ترجمہ ایوارڈ کے لیے ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کی طرف سے تشکیل کردہ مشیروں کے پینل کا رکن۔
۱۱۔ سال ۲۰۱۹ کے لیے جے اینڈ کے کلچرل اکیڈمی برائے اردو ترجمہ ایوارڈ کے پینل آف ایڈوائزرز کے رکن۔
۱۲۔ نیشنل ٹرانسلیشن مشن (منسٹری آف ایچ آر ڈی)، میسور کے زیر انتظام مترجموں کے قومی رجسٹر میں رجسٹرڈ رہے۔
۱۳۔ ان کی ایک مختصر کہانی ’فیصلہ‘ حال ہی میں ۲۰۱۸ میں لاہور سے شائع ہونے والے ماہانہ میگزین ’سویرا‘ کے ٦۰۰ صفحات پر مشتمل ’سٹوری نمبر‘ میں شائع ہوئی ہے۔

انتقال: 29 نومبر 2024 (آدرش کالونی، اڈھمپور)

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بلراج بخشی: اپنی شرطوں کا شاعر

■ پروفیسر قدوس جاوید، جموں

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر، اسے عیب جانئے یا ہُنر
وہی بات آئی زبان پر جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی
(یگانہ چنگیزی)

شاعر اگر اپنی شخصیت اور شاعری دونوں پہلوؤں سے سچا اور کھرا ہو تو اس پر لکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بلراج نے بڑی خوداعتمادی کے ساتھ خود کہا ہے:

مرے بارے میں وہ اگر لکھے
جو بھی لکھنا ہے بے خطر لکھے

بلراج بخشی کھلی کتاب تھا لیکن اس کتاب کے ہر ورق میں بلراج کے نشۂ خود شناسی و خود فریبی کی انگنت حکایتیں بکھری پڑی ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ بلراج بخشی کے اشعار صرف اشعار نہیں ہیں، بلراج کے شب و روز کی تخلیقی و جمالیاتی تصویریں ہیں۔ لیکن بلراج کی غزل کی جمالیات ان کے معاصرین کی غزل کی جمالیات سے مختلف ہے لیکن کتنی مختلف ہے اگر یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کم از کم جموں و کشمیر میں معاصر غزل کو سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا۔

جموں و کشمیر میں عرش صہبائی، میکش کاشمیری، عابد مناوری، ودیا رتن عاصی اور حکیم منظور وہ شعراء ہیں، جنھوں نے اپنے بعد آنے والے اُردو شاعروں کو غزل کی ایک زرخیز زمین فراہم کی اور ۱۹۷۰ء کے آس پاس جموں و کشمیر کے جن نئے شاعروں نے تاریخ اور کلچر، فکر اور فن کی تازہ لہروں کو گرفت میں لے کر غزل کی آبیاری کی، ان میں فاروق مضطر، ایاز رسول نازکی، احمد شناس، فاروق نازکی، پرتپال سنگھ بیتاب، رفیق راز، مظفر ایرج، خالد بشیر، عشاق کشتواڑی اور شفق سوپوری وغیرہ کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔ بلراج بخشی نے اپنے ان ہی معاصر شاعروں کے ساتھ، لیکن اپنی ڈگر پر چلتے ہوئے، اردو ادب میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کیا۔

بلراج بخشی بے پناہ صلاحیتوں کا حامل شخص تھا۔ بٹوارے کی لکیریں بچپن میں ہی اس کی زمینیں بہا لے گئی تھیں لیکن اس نے اپنی دُنیا آپ پیدا کی۔ بلراج اپنے وجود کے اندر 'تخلیقیت' (CREATIVITY) کا سمندر اور باہر 'وژن' کا کھلا آسمان رکھتا تھا۔ اس کی تخلیقی زمین پر شاعری اور افسانہ کی فصلیں اُگتی تھیں اور فکری آسمان پر تحقیق و تنقید، صحافت اور برقی ذرائع ابلاغ و ترسیل کے چاند تارے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ بلراج یہ نہیں مانتا تھا کہ اس کے اندر یہ سبھی خوبیاں 'خدائے بخشندہ' کی بخشی ہوئی تھیں، وہ انہیں اپنے زورِ بازو کا کرشمہ سمجھتا تھا۔ بلراج زندگی بھر دوسروں کو دعائیں دیتا رہا، نہ جانے دل سے یا دماغ سے، لیکن خود بسترِ مرگ پر بھی کسی کی دُعاؤں کی خیرات قبول کرنے سے انکار کرتا رہا۔ لیکن ذرا رُک جائیں، اگر سوانحی مضمرات کی دنیا میں داخل ہو گئے تو راقم اور قاری دونوں ہی راہ سے بھٹک سکتے ہیں۔ لہٰذا فی الوقت بلراج بخشی کی شعری کائنات تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھیں۔ پھر بھی مسئلہ یہ ہے کہ بلراج کی شاعری بھی اس کی حدیثِ زندگی کی ہی تفسیریں ہیں۔ یقین نہ آئے تو چند اشعار دیکھ لیں:

ستم نئے سے نئے ہم پہ ڈھائے جاتے ہیں
کہ رونا چاہتے ہیں جب، ہنسائے جاتے ہیں

خطائیں ایسی کہ ہوتی ہیں خود بخود سرزد
فریب ایسے کہ دانستہ کھائے جاتے ہیں

درد میرے ہیں تو آرام سے رہنے دیتے
تم اگر مجھ کو میرے حال پہ رہنے دیتے

میرے حالات بیاں کرتے ہیں از خود مجھ کو
کچھ مجھے اپنی زباں سے نہیں کہنے دیتے

جسم و جاں، فکر و انا، کچھ تو بچا ہے میرا
حادثہ کوئی پتہ پوچھ رہا ہے میرا

بلراج بخشی کے شعری مجموعے 'مٹی کا موسم' (2021) کے حوالے سے کہہ سکتے ہیں کہ بلراج غزل کا شاعر ہے۔ لیکن اس نے نظمیں بھی لاجواب لکھی ہیں۔ دراصل بلراج کو روشِ عام پر چلنا کبھی منظور نہ تھا اس لئے غزلوں کے اس مجموعے کی ترتیب

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

اس طرح رکھی ہے کہ ہر پانچ، سات یا دس غزلوں کے بعد ایک نظم کو اس خوش اسلوبی سے سجا دیا ہے جیسے کوئی نمازی فرائض کی ادائیگی کے بعد وقفے وقفے سے 'نوافل' بھی کی سعادت بھی حاصل کرتا جائے۔ یہاں پھر بحث چھڑ سکتی ہے کہ بلراج کی غزلیں بے مثل ہیں یا اس کی نظمیں یادگار۔ لہٰذا ذاتی ترجیح کو پسِ پُشت ڈال کر بلراج کی غزل گوئی پر ہی کچھ باتیں کر لیں تو غلط نہیں ہوگا۔

بلراج بخشی کی غزل گوئی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بلراج بخشی کی غزلیہ شاعری لسانی اعتبار سے عصری اُردو غزل کی لفظیات (ڈکشن) کے برتاؤ کے باوجود معنی اور کیفیت کے لحاظ سے بڑی گہرائی رکھتی ہے۔ خاص طور پر بلراج بخشی کی غزلیہ شاعری تازہ کار افکار وخیالات کی وجہ سے توجہ طلب ہے۔ ان کی غزلوں کے اشعار کلاسیکی ہی نہیں جدید غزل کے مزاج کے ساتھ مفاہمت سے زیادہ سرکشی کا رشتہ رکھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بلراج بخشی اپنی شرطوں کے ساتھ اُردو غزل کی مضبوط و مستحکم روایت کی زمین پر کھڑے ہیں۔ بلراج بخشی نے زندگی اور زمانہ کی سچائیوں کا ذاتی طور پر سامنا کر کے اور ان کے اندر رہ کر بہت ہی حوصلے کے ساتھ جھیلا اور برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں جھوٹ اور ریاکاری نہیں سچے تجربات و مشاہدات آگ میں تپ کر شعر کے سانچے میں ڈھل جانے والے جذبات واحساسات ہیں۔ بلراج بخشی کی غزلوں میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں، چند اشعار دیکھئے:

میرے ہاتھوں کی لکیروں سے نکل کر آئے
وہ اگر میرا مقدر ہے تو چل کر آئے

ستم نئے سے نئے ہم پہ ڈھائے جاتے ہیں
کہ رونا چاہتے ہیں جب، ہنسائے جاتے ہیں

ہمیں تو روز وفا کا ثبوت دینا ہے
کہ ہم تو وہ ہیں جو روز آزمائے جاتے ہیں

وفا، خلوص، شرافت، لحاظ اور یقین
زمیں کے کون سے خطے میں پائے جاتے ہیں

گذشتہ چالیس پچاس برسوں سے شعر کہنے کے باوجود بلراج بخشی کا ایک عرصہ تک کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بلراج بخشی عام زندگی اور شعر و ادب میں بھی ہر کام پوری سنجیدگی اور وقار کے ساتھ موقع محل دیکھ کر کرنے کا عادی تھا اِسی لیے نہ تو ان کی شخصیت میں ہلکا پن تھا اور نہ ہی ان کی ادبی تحریروں میں عامیانہ پن ہے۔ بلکہ ان کی تحریر کا اپنا ایک الگ معیار ہے۔ چونکہ بلراج بخشی خود ایک سلجھے ہوئے نقاد ہیں اس لیے اپنی ہر تخلیق کے معیار اور مزاج سے جب تک وہ خود مطمئن نہیں ہو جاتے اسے شائع نہیں کراتے۔ بلراج بخشی نے اپنی غزلیات کا مجموعہ پہلے 'میرے گناہ سبھی' کے نام سے ترتیب دیا تھا، بعد میں اس کا نام بدل کر ہٹی کا موسم' کے نام سے 2021 میں شائع کیا۔ دراصل یہ ان کی نمائندہ غزلوں کا انتخاب ہے۔ اس شعری مجموعہ میں تقریباً سو غزلیں شامل ہیں۔ ان میں چھوٹی اور بڑی ہر طرح کی بحروں کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً چھوٹی بحروں میں لکھی گئی غزلوں کے یہ اشعار دیکھئے:

سیڑھی سے چوبارے تک آ
میرے چاند ستارے تک آ

اپنا مطلب چُن لینا
میں جو بولوں سن لینا

اپنے آپ سے ڈر جانا
اور چپ چاپ گذر جانا

دن سے رات لڑی ہوتی
اور پھر شام پڑی ہوتی

چھوٹی بحروں میں کہی ہوئی ایسی غزلوں کا مکالماتی انداز اور خطابیہ لب ولہجہ، اشعار کو قاری کے دِل و دماغ میں فوراً اُتار دیتا ہے اور قاری شعر کے معنی و مفہوم، تاثر اور کیفیت میں کھو جاتا ہے۔ ایسی چھوٹی بحروں میں مومن اور غالب کے علاوہ بلراج بخشی کے ہم عصر شاعروں ودیارتن عاصی، ندا فاضلی، رفیق راز، ایاز نازکی، شفق سوپوری وغیرہ کے یہاں بھی غزلیں ملتی ہیں مثلاً مومن کی چھوٹی بحر کی ایک غزل کا یہ شعر ہر شخص کی زبان زد ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اور غالب کی غزل کا یہ شعر بھی زبان زد عام ہے:

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

دِل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اِسی طرح بلراج بخشی کے یہاں بڑی بحروں میں بھی غزلیں ملتی ہیں مثلاً:

ہزار سرگوشیوں کے سائے میں کھیلتی کائنات گذرے
کبھی تو آوارہ خوشبوؤں کے حسین پہلو میں رات گذرے

آتش عشق میں اِس طرح دُھواں ہو جاؤں
کوئی آواز نہ ہو اور بیاں ہو جاؤں

کچھ بھی ہو سبب چاہے اشکوں کی روانی کا
احسان بہت ہے اِس، بہتے ہوئے پانی کا

کچھ بہکتے جایئے اور کچھ سنبھلتے جایئے
جیسے بھی ہو وقت کی زد سے نکلتے جایئے

دراصل مختلف بحروں میں شعر کہنا شاعر کی پُرگوئی اور قوتِ اظہار کی دلیل ہے اور اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ بلراج بخشی کی غزلیں ان کی منفرد اور معتبر شاعرانہ حیثیت کے ثبوت ہیں۔ بلراج بخشی کھلے دل و دماغ کے ایک ایسے تعلیم یافتہ اور بصیرت مند شاعر ہیں جو گوشہ نشینی کے بجائے زندگی اور زمانہ کے حقائق اور مسائل کا سامنا کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا یہی رویہ ایک طرف جہاں ان کی شاعری میں حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے وہیں دوسری جانب ان کی شاعری میں موضوعاتی اعتبار سے تنوع اور تازہ کاری بھی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً زمانہ کی بے رُخی اور بے وفائی کے حوالے سے بلراج بخشی اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

وفا، خلوص، شرافت، لحاظ اور یقین
زمیں کے کون سے خطے میں پائے جاتے ہیں

لحاظ رکھتا ہوں احباب کا بڑی حد تک
میں ان کی سازشوں سے بے خبر نہیں ہوتا

لازم ہمیں یہ دوستی کے دو قدم ہوئے
کوئی اِدھر بھی اک قدم آتا ہوا ملے

اس طرح زندگی گذار آئے
اب کسی پر نہ اعتبار آئے

یاس وحرماں، دردِ وغم کا اظہار اُردو غزل کا ایک مرغوب موضوع رہا ہے۔ میر تقی میر نے تو اپنی پوری شاعری کو ہی درد وغم کا مجموعہ کہا ہے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

ذاتی کرب اور درد وغم کا بیان بلراج بخشی کے اشعار میں بھی ملتا ہے۔ ایسے اشعار میں بلراج بخشی کے یہاں نہ تو یاسیت پسندی ہے اور نہ اعترافِ شکست بلکہ وہ درد وغم کو بھی زندگی کا ایک لازمہ قرار دیتے ہوئے ہر رنج وغم کا خوشی خوشی سامنا کرنے کا درس دیتے ہیں۔

بلراج بخشی میر تقی میرؔ کے درج بالا شعر پر یقین رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہو:

کوئی سراغ نہ چہرے پہ چھوڑنا بلراجؔ
خزانے درد کے دِل میں چھپائے جاتے ہیں

غم کا موسم اُداس سا موسم
جیسے خوشیوں کی رُت سہانی ہے

بلراج بخشی کی غزلوں میں کلاسیکی غزل کی شعریات کا التزام بھی ملتا ہے انھوں نے الفاظ کے لسانی برتاو، مضمون آفرینی، معنوی تہہ داری اور غزل کی داخلی ہیئت کی تازہ کاری کی بناپر اپنی غزلوں میں ایک ایسی انفرادیت پیدا کرلی ہے جوان کی پہچان بن گئی ہے۔ اِسی لیے بلراج بخشی کی غزلیں ان کے دیگر معاصرین کی غزلوں کے مقابلے میں الگ سے پہچانی جاتی ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رقیب ہو گیا میرا ہی پیرہن آخر
یوں آشکار ہوا مجھ پہ وہ بدن آخر

الاؤ جل گیا نوحہ گروں کا جشن ہوا
اس اہتمام سے رُخصت ہوئی تھکن آخر

مقدر تھا ستاروں کے حوالے
ہوئے ہم بھی سہاروں کے حوالے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

چہرے سے نگاہوں کو ہٹانے نہیں دیتا
جادو ہے کہ جو ہوش میں آنے نہیں دیتا

بلراج بخشی کے شعری تجربات اکثر و بیشتر ان کی اپنی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے اکثر و بیشتر اشعار سے ان کی ذاتی حدیث زندگی کی صدائیں آتی سنائی دیتی ہیں لیکن اس طرح کہ بلراج بخشی کی آواز ہر قاری کو اپنے ہی دِل کی آواز معلوم ہوتی ہے مثلاً:

دنیا کا یہ دستور گوارا نہیں ہوتا
ہم سب کے ہوئے کوئی ہمارا نہیں ہوتا

میں خود ہوں یا ہوں مرے دوست یا مرے دُشمن
مرے خلاف سبھی زہر اُگلتے رہتے ہیں

عجیب سلسلوں میں ہم نے زندگی تباہ کی
ثواب کی ہیں تلخیاں نہ لذتیں گناہ کی

بلراج بخشی کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں جدید غزل کے موضوعات مثلاً ذات، تنہائی، ہمزاد، شکوہ زمانہ، انسانی وجود کی لایعنیت، تشکیک وغیرہ کو کسی نہ کسی طور پر برتا گیا ہے اس کے ساتھ ہی سورج، سایہ، سمندر، صحرا، دھوپ وغیرہ استعاروں کا استعمال بھی ملتا ہے۔ لیکن فیشن پرست جدید شاعروں اور بلراج بخشی میں فرق یہ ہے کہ اپنی تمام تر جدت پسندیوں کے باوجود وہ اپنے اشعار کو تفہیم و تعبیر کے دائروں سے باہر نہیں ہونے دیتے اور ہر صاحب ذوق قاری تک ان کے اشعار کے معنی و مفہوم کی ترسیل ہو جاتی ہے۔ بلراج بخشی کے درج ذیل اشعار میں جدیدیت کے رُجحان کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں:

وہ سب کو دھوپ سناتا ہوا ملے
کوئی درخت چھاؤں لُٹاتا ہوا ملے

بیاں میرا، زباں میری نہیں ہے
میرے اندر کوئی جب سے مکیں ہے

کچھ اُجالے کے لیے جل ہی گیا دامن اگر
ہم کہاں کے ہو گئے سورج کے جلتے جایئے

ایک حالت جو تذبذب کی بنی رہتی ہے
اپنے سائے سے بھی دِن رات ٹھنی رہتی ہے

میں بھی تنہا ہوں مرے ساتھ بھی تنہائی ہے
آپ نے جب سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہے

گھنے درخت کی چھاوں چرا گیا کوئی
ہوا کے بھیس میں پتے گرا گیا کوئی

غزل چاہے روایتی ہو یا کلاسیکی، ترقی پسند ہو یا جدید اور مابعد جدید، ہر لحاظ سے کہ غزل کے اشعار میں موضوع اور بیان کے معاملے میں ہنرمندی اور سلیقہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یعنی شعر میں حسن خیال بھی ہو اور حسن بیان بھی۔ اکثر اوقات قیمتی خیال بھی بیان کی کمزوری کی وجہ سے اپنا تاثر کھو بیٹھتا ہے اور کبھی محض حسن بیان یا سلیقۂ اظہار کی وجہ سے ادنیٰ موضوع بھی دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔ لہٰذا عمدہ شاعر وہی ہے، جس کے اشعار میں حسن خیال بھی ہو اور حسن بیان بھی۔ بلراج بخشی کے یہاں اس کی بہترین مثالیں ملتی ہیں یہ چند اشعار دیکھئے:

دُشمنی ہے تو سلیقے سے نبھا کر دیکھو
دل بھی مِل جائینگے، تم ہاتھ ملا کر دیکھو

مری نظر کو مہکتے گلاب کیا دو گے
کہ نیند دے نہ سکے تم تو خواب کیا دو گے

یہ خامشی بھی عجب امتحان ہے بلراجؔ
سوال ہی نہیں کوئی جواب کیا دو گے

ان سے ملنے یا نہ ملنے کا سبب کچھ بھی نہیں
وہ زمانہ کہ بہت کچھ تھا پر اب کچھ بھی نہیں

ایک تنکے کا سہارا بھی نہیں ہے بلراجؔ
اب کے طوفان جو آئے تو مچل کر آئے

۱۹۶۰-۷۰ء کے بعد غزل گو شعراء کا ایک امتیاز یہ بھی رہا ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں روایتی اور کلاسیکی غزل کے موضوعات پر اپنے سامنے کی زندگی اور زمانہ میں بکھرے پڑے عصری موضوعات کو ترجیح دی ہے۔ ادبی اصطلاح میں اسے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

’عصری شعور‘ یا ’عصری حسیت‘ کہتے ہیں۔ برصغیر کے دوسرے ادبی مرکزوں دلی، لکھنؤ، کراچی اور لاہور وغیرہ کی طرح ریاست جموں و کشمیر کے اُردو شعرا کے یہاں بھی عصری حسیت کے شاعرانہ اظہار کی مثالوں کی کمی نہیں۔ اس ضمن میں پرتپال سنگھ بیتاب، رفیق راز، مظفر ایرج، رخسانہ جبیں، شبنم عشائی اور شفق سوپوری وغیرہ کی غزلیں عمدہ مثال ہیں۔ بلراج بخشی کی غزلوں میں بھی ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں ان کی عصری حسیت کھل کر سامنے آئی ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

اب تو بچوں میں نظر آتی ہے تہذیب ایسی
نظر آتے نہیں گلیوں میں کھلونے والے

ہم نے مِل جل کے جلایا ہے جو گھر کس کا تھا
اپنی تلوار، گلا اپنا تھا، ڈر کس کا تھا

اس طرح ہو گئے تقسیم کہ سوچا بھی نہیں
کس کی شاخیں تھیں، ثمر کس کے، شجر کس کا تھا

بلراجؔ گھڑی بھر کے لیۓ عمر گنوا دی
لمحوں کے عوض کوئی زمانے نہیں دیتا

بیڑیاں کاٹتا ہوں جب تدبیر سے میں
باندھ دیتا ہے بہانے سے مرے ہات کوئی

نہ جانے کس نے نئے سال کی مبارک دی
رواں برس میں تو موسم بھی آفتابی ملے

بلراج بخشی کی غزلوں کی ایک نمایاں خوبی ان کی سہل اور سادہ بیانی ہے۔ روایتی اور کسی حد تک کلاسیکی شاعری میں بھی۔ ریاست جموں و کشمیر سمیت اُردو کے تمام مراکز میں شعر میں پر تصنع الفاظ کے آزادانہ استعمال کا رواج عام رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر روایتی اور کلاسیکی شاعری میں تجربات و مشاہدات کی لسانی تشکیل نہیں ہو پاتی۔ شعوری طور پر محض مصرعے موزوں کرنے کے لیے ڈھونڈ کر ردیف اور قافیے، تشبیہ و استعارہ لانے کی وجہ سے نہ تو شعر میں فطری روانی اور جامعیت پیدا ہو پاتی تھی اور نہ ہی غزل میں فطری تغزل کی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ لیکن بلراج بخشی نے اپنی غزلوں میں ایسی سادہ اور سہل فطری اور مانوس الفاظ استعمال کیۓ ہیں جو ان کے نادر تجربات و مشاہدات، جذبات و احساسات کی لسانی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں مثلاً:

یاد آتا ہے وہ بھی ایک زمانا تھا
یوں ہی ملنا جلنا آنا جانا تھا

ایک وعدہ ترا وفا نہ ہوا
اس زمانے میں ورنہ کیا نہ ہوا

جانے کیسی بہار آئی ہے
زخم اب کے کوئی ہرا نہ ہوا

تنہائی کا درد اکیلے سہتے ہو
تم یادوں کی کس دنیا میں رہتے ہو

کہیں بھی زندگی اپنی گزار سکتا تھا
وہ چاہتا تو میں دانستہ ہار سکتا تھا

آتش عشق میں اس طرح سے دھواں ہو جاؤں
کوئی آواز نہ ہو اور بیاں ہو جاؤں

مذکورہ بالا اشعار میں تجربات و مشاہدات کی لسانی تشکیل کا عمل صاف دکھائی دیتا ہے لیکن اس طرح کے اشعار میں بلراج بخشی کی جدید عصری حسیت کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ المختصر بلراج بخشی اردو کی عصری شاعری میں دوسرے شاعروں کی بھیڑ میں گم نہیں ہوتے بلکہ اپنے منفرد انداز، تازہ ترین شعری رویوں اور لفظیات و معنیاتی نظام کی وجہ سے سب سے الگ ہی نہیں سب سے ممتاز بھی نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

27, Green Hill Colony
Bhatindi Jammu - 181152
Mobile no. 941901047

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بلراج بخشی کی کہانیاں

■ علی احمد فاطمی، الہ آباد

بلراج بخشی کا افسانہ 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' کا شمار ایک بہترین افسانے میں کیا جائے گا۔ ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ ملک میں بڑھتی ہوئی غریبی، مہنگائی، کورپشن وغیرہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے۔ چنانچہ ایک شہری نے عام لوگوں کے ساتھ مل کر غیر سیاسی انداز میں احتجاج درج کیا۔ اسی شہری کو بعدازاں جب ایک شناختی کارڈ کی ضرورت پڑتی ہے تو سرکاری افسر کہتا ہے: "یہ وزارت داخلہ کی رپورٹ ہے۔ پچھلے سال جو حکومت مخالف جلوس نکلے تھے تم ان میں پیش پیش تھے....... ہم مم ...... یہ لکھا ہے....... تم اچھل اچھل کر نعرے لگا رہے تھے......." ('ایک بوند زندگی' صفحہ ۳۹)

شہری جواب دیتا ہے: "......وہ تو غیر سیاسی تحریک تھی......"

یقیناً ...... کمشنر میز پر ہاتھ مار کر دہاڑا.......... اور اسی لیے خطرناک تھی....... سیاسی تحریکوں کو تو موڑا توڑا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے مفادات حکومت سے مختلف نہیں ہوتے۔ مگر عوامی غم و غصے والی تحریکوں کو دبانا مشکل ہوتا ہے ...... آج تک یہاں صرف مذہب یا مسلک کے نام پر تشدد ہوتا رہا ہے جس میں دونوں فرقے آمنے سامنے صف آرا ہوتے ہیں ...... دونوں ایک دوسرے کے دشمن ...... اور ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں........ لیکن پچھلے سال پہلی بار ایسا ہوا کہ جمہوریت .... شہری حقوق .... کورپشن .... اور .... دہشت گردی جیسے abstract مدعوں پر بھی لوگ سڑکوں پر نکل آئے .... چاہے وہ کسی بھی مذہب کے تھے.......... اس تحریک میں دشمن مبہم اور غیر واضح تھا........ یعنی بطور دشمن کسی کی بھی نشاندہی نہیں کی جاسکتی تھی ...... یہ بہت خطرناک صورتحال تھی........... ملک میں انارکی پھیل سکتی تھی .... تشدد پھیل سکتا تھا........... اور اور تم اس میں شامل تھے........."

"لیکن انارکی ہوئی تو نہیں ...... تشدد بھی نہیں ہوا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہم نے نہیں ہونے دیا۔" ...... میز پر ہاتھ مار کر کمشنر پھر گرجا۔

"یہ حکومت کی حکمت عملی تھی کہ ہم نے تشدد نہیں ہونے دیا....... بروقت کارروائی سے حالات کو سنبھال لیا گیا ...." ('ایک بوند زندگی' صفحہ ۳۹تا۴۰)

یہ سوال و جواب بھی دیکھیے: "لیکن آئیڈنٹی کارڈ کے لیے میری درخواست کا میرے سیاسی نظریات کا کیا تعلق؟"

"افسوس کہ تم جیسے لوگ حکومت کے جاری کردہ دستاویز کی اہمیت نہیں سمجھتے........"

('ایک بوند زندگی' صفحہ ۴۱)

سوال در سوال، جواب در جواب۔ اور پوری کہانی میں نہ صرف دفتری نظام بلکہ حکومت کا داخلی جارح نظام بھی عام آدمی کو نہ صرف پریشان کرتا ہے بلکہ اس کی شناخت بھی رد کر دیتا ہے۔ افسر کی جمہوریت مخالف بے حسی، جارحیت، انسانی حقوق کی پامالی، ریزہ خیالی اور نتیجہ عام شہری کا خالی ہاتھ اور پھر افسر کا یہ جواب:

"مجھے افسوس ہے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہاں سے باہر جا کر تم یہی کہو گے کہ میں نے ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کی کوشش کی........."

('ایک بوند زندگی' صفحہ ۴۴)

جمہوریت جب جارحیت میں بدلتی ہے تو فسطائیت بن جاتی ہے جہاں منطق اور logic کا گذر کم ہی ہوتا ہے اور مزاحمت یا احتجاج تو بالکل ہی نہیں۔ کہانی کار نے محض دو فریقوں کے مابین مکالموں کے ذریعہ بے حد معنی خیز اور فکر انگیز باتیں کی ہیں، جو آج کے نظام سیاست اور اقتدار کی حقیقت پیش کرتی ہیں۔ اور یہ حقیقت اس وقت المناک شکل اختیار کر لیتی ہے جب کلائمکس میں اس عام شہری کا درد انگیز سوال جنم لیتا ہے اور وہ بے حس افسر سے کہتا ہے:

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

''کیا جناب والا مجھے ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کی عنایت کرسکتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''میرے دو بچے بھی ہیں جناب کل انہیں بھی اسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔

''میں نہیں چاہتا کہ انہیں بھی کبھی اس اذیت سے گزرنا پڑے ...... چونکہ مطلوبہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہنے پر یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ میں .... ہوں .... اگر ڈیتھ سرٹیفکیٹ مل جائے تو بعد از مرگ تو میری آئیڈینٹی بہ آسانی ثابت ہو جائے گی کہ .... میں بھی تھا اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ .... ایک سرکاری دستاویز ہوسکتا ہے ان کے کسی کام آجائے ....' ('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۴۵)

ایک زندہ انسان کا اپنی زندگی میں ہی مرجانے کی تصدیق کی خواہش انسانی حرمت اور انسانیت کی ایسی تذلیل ہے کہ جو اس ترقی پذیر معاشرے پر قابض اہل اقتدار کی بے حسی کی غماز ہے۔ کہانی اس المیہ کو مفکرانہ اور فنکارانہ انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہے اور وجود سے عدم وجود پر ختم ہو کر غیر معمولی تاثر چھوڑتی ہے۔ یہ ایک کامیاب کہانی ہے۔

اسی طرح ایک اور کہانی ہے 'مشترکہ اعلامیہ' ہندو پاک کی جیلوں میں عام انسان بطور ملزم قید ہیں۔ کچھ قصوروار زیادہ تر بے قصور ایک عالیشان ائر کنڈیشنڈ عمارت میں دونوں ممالک کے اعلیٰ افسروں کی میٹنگ ہورہی ہے۔ ایک طرف راؤرتن سنگھ اور دوسری طرف پیرزادہ نصرت یار خاں۔ دونوں انسانی حقوق، انسانی اقدار اور انصاف پر اعلیٰ قسم کی گفتگو کرتے ہیں لیکن جب براہ راست قیدیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کی حالت دیکھ کر انسان اور انسانیت دونوں شرمسار ہو جاتے ہیں لیکن نہیں شرمندہ ہوتے افسران کے جملے دیکھیے:

''......اس کی حالت دیکھ کر سب کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ کسی کو بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ کسی انسان کی یہ ہیئت بھی کبھی بن سکتی ہے اور اس طرح دکھائی دینے والی کوئی مخلوق کبھی انسان کہلاتی ہوگی۔ بدترین قسم کے حادثے میں بھی کوئی انسان اس ہیئت کذائی میں نہیں آسکتا تھا.....''

('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۷۷)

اور یہ حال دونوں طرف کے قیدیوں کا تھا۔ غیر ضروری ٹارچر، زخموں کے انبار، ہوش وحواس غائب۔ اسلامی دردمندی اور ہندوستانی عدم تشدد دونوں معدوم۔ دونوں طرف کے افسروں کو پہلے غصہ آتا ہے لیکن جلد ہی ایک مخصوص بے حس نظام کے زیر اثر غصہ زائل ہونے لگتا ہے اور پھر ایک سمجھوتہ۔ یہ سمجھوتہ ہی آج کی سیاست ہے۔ آج کی اقتداری ذہنیت جس کا طریقۂ کار جہاں سب کچھ صیغہ راز ہی میں رہنے دینے میں عافیت ہے اور نہ نقص امن ہوجائے گا۔ اور یہ جملہ:

''......دونوں ممالک کے وسیع تر مفاد میں ہم سب نے مشترکہ فیصلہ لیا ہے کہ ان معلومات اور حقائق کو صیغہ راز میں رکھا جائے.....'' ('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۷۹)

اور دونوں ملکوں کے افسروں نے ان کاغذات پر بخوشی دستخط کر دیئے اور سارے کام آسانی سے نپٹ گئے۔ قیدیوں کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور افسروں کے چہروں پر خوشی۔ اس لیے کہانی کا آخری جملہ ہے: ''سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔'' ('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۷۹)

کہانیاں اور بھی ہیں لیکن ان دو کہانیوں کے بارے میں، میں پورے تیقن کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس دور میں نئی اردو کہانیوں کی بھیڑ میں کم از کم میری نظر سے ایسی سماجی اور سیاسی نوعیت کی کہانیاں نہیں گذریں۔

اردو کی نئی کہانیوں کا دائرہ کمزور نہیں، لیکن محدود ضرور ہوگیا ہے۔ وہ عموماً فرقہ واریت، اقدار کی شکست وریخت یا زیادہ سے زیادہ بڑے شہروں کی تیز رفتار زندگی میں سمٹ گئی ہیں اور ان میں عالمی اور انسانی مسائل کم نظر آتے ہیں۔ حقوق انسانی کی پامالی اور حد تو یہ ہے کہ ہندو پاک کے رشتوں پر بھی کہانیاں نہیں ملتیں۔ بقول وارث علوی: آج کی کہانیاں فطری سطح پر محدود ہوگئی ہیں اور نہ ہی ان میں ایسی بیداری ہے کہ جن کو پڑھ کر راتوں کی نیند حرام ہوجائے۔ مجھے وارث علوی سے اتفاق تو ہے لیکن بلراج بخشی کی ان دونوں کہانیوں اور چند اور کہانیوں کو پڑھنے کے بعد ہلکا سا اختلاف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر چند کہ یہ دونوں کہانیاں ہندوستان سے زیادہ ہندو پاک کے سیاسی

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

رشتوں ہی کو چھوتی ہیں لیکن پہلی کہانی ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں ایک انسان کے وجود، عدم وجود اور آج کے ترقی یافتہ دور میں اس کی اصل شناخت کیا ہے، اس پر گہرا سوال کرتی ہے۔ طاقت اور صارفیت کے اس دور میں ہم انسانیت کو کہاں اور کتنا پیچھے چھوڑ آئے ہیں اس پر گہرائی سے سوال کرتی ہے اور بھی فقط دو کرداروں کے مکالموں کے ذریعے۔ اس طرح دو ملکوں کی سیاست اور جارحیت نے قیدیوں کو ایک جانور سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔ یہ دونوں کہانیاں صرف دو ملکوں کا نہیں آج کے انسانوں کا اعلامیہ بلکہ المیہ ہیں جسے بلراج بخشی نے نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔

بلراج بخشی آج کے حالات اور آج کے انسانوں پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔ لیکن نگاہ کا نظریہ میں بدلنا، نظریہ کا فلسفہ اور فلسفہ کا فکشن میں ڈھل جانا ایک دشوار گذار اور نازک تخلیقی مرحلہ ہے، جس سے بلراج کامیابی سے گذر گئے ہیں اور قاری اس سے بھی آگے، کہانی کے بھی آگے ان احساسات و خیالات سے گذر جاتا ہے جو کہانی کے خاتمہ پر شروع ہوتے ہیں اور یہی ایک عمدہ کہانی کی کامیابی ہے کہ وہ اس مقام پر ختم ہو اسی موڑ پر فکر و خیال کی ایک نئی دنیا شروع ہوتی ہو۔ ان دنوں ایسی کہانیاں کم لکھی جا رہی ہیں لیکن ایک عرصہ کے بعد ان دونوں کہانیوں نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ یہ کہانیاں ہندوستانی اور پاکستانی ہندوؤں یا مسلمانوں کی کہانیاں کم ہیں، انسان کی کہانیاں زیادہ ہیں۔ اس سے کہانی کا دائرہ از خود بڑا ہو جاتا ہے۔

ایک کہانی اور ہے 'کیا نہیں ہو سکتا' جو سماجی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ لیکن غریبی، مہنگائی اور کورپشن کی اس کہانی میں وہ اپیل نہیں ہے جو ان دونوں کہانیوں میں ہے حالانکہ تکنیک وہی ہے۔ اس میں راست گوئی تو ہے مگر loudness زیادہ ہے۔ براہ راست سیاسی و سماجی صورت حال کی پیش کش میں بہر حال یہ خطرہ بنا رہتا ہے جب تک اس میں انسانی دردمندی اور سماجی بصیرت کی فنکارانہ پیش کش نہ ہو۔ حالانکہ کہانی کو خاتمہ پر لا کر ایک طنزیہ اشارہ دے کر اس میں معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور لغت سے ہی مہنگائی، کورپشن وغیرہ کے الفاظ غائب کر دیے گئے ہیں ہی، اور قانون بھی نافذ کر دیا گیا ہے کہ اب ایسے الفاظ کا استعمال خلاف قانون ہوگا۔ یہ جملے دیکھیے:

''......جب یہ الفاظ کسی بھی ملکی زبان کی ڈکشنری میں ہیں ہی نہیں تو ان الفاظ کو بولنا......یا لکھنا خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے لہٰذا یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ قانون بن گیا ہے......آج کے بعد کوئی آدمی یا عورت......چھوٹا یا بڑا عوامی طور پر یا اپنے گھر میں سنجیدگی سے طعنے کے طور پر......یا مذاق میں بھی غریبی، مہنگائی اور کورپشن کے الفاظ منہ سے نہیں نکالے گا......اور نہ ہی لکھے گا......ایسا کرنا قابل دست اندازی پولیس ہوگا کوئی بھی آدمی اگر کسی کے خلاف تحریری شکایت کرے گا کہ اس نے اپنے منہ سے ان تینوں میں سے کسی لفظ کو نکالا ہے یا لکھا ہے۔ تو ملزم کو خود ہی ثابت کرنا پڑے گا کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہے......ان تینوں الفاظ میں سے کسی کو بھی منہ سے نکالنا یا لکھنا ملک کے خلاف غداری ہوگی......اور یہ جرم......ملک کو بدنام کرنے والا یہ گھناؤنا جرم......ایک سنگین جرم سمجھا جائے گا'۔

('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۱۰۰)

اندھیر نگری میں کیا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی اس کہانی کا عنوان ہے۔

ایک عنوان اور ہے 'فیصلہ'۔ آئیے دیکھیں کہ یہاں فیصلے کی نوعیت کیا ہے۔ معاملہ فیصلہ کا ہے اس لیے اس کہانی میں ایک جج کا کردار ہے۔ جج مظفر علی رانا اور ٹیلیوژن ہے۔ بلراج بخشی کا اپنا کردار۔ مختلف چینل، یوگا، جیوتش، مباحثہ اور خبر۔ کہانی خبر کے چینل پر رک جاتی ہے۔ جموں کشمیر کا علاقہ، شدید برفباری اور جج کی چائے نوشی۔ سموار، جس میں گرم چائے ہے، پر وہ نئے الیکٹرونک لوازمات کے آگے اپنی اہمیت کھو رہا ہے۔ نوکر کی مداخلت سے کہانی کا رخ بدلتا ہے۔ برفباری سے راستے بند ہیں، اشیائے ضروریہ عنقا ہیں۔ ناشتے میں انڈے مکھن کی جگہ صرف پراٹھے، آلو۔ گوشت غائب۔ عدالت کی تیاری، پرانے راستے کا سفر، جنگلی مرغ کا نظارہ......سب خوبصورتی سے کہانی کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ اچانک عدالت میں وہی مرغ گھس آتا ہے۔ شور وغل، پکڑنے کی کوشش۔ یہ جملے دیکھیے جو کہانی کے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

لطف اور معنویت میں اضافہ کرتے ہیں:

''......ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے وہ سب انتہائی ہوشیاری کے ساتھ مرغ کی طرف بڑھنے لگے۔ دراصل وہ اسے ایک کونے میں کھدیڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آس پاس دیکھتے ہوئے مرغ بڑی ہوشیاری سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اچانک مرغ نے رک کر ٹھاٹ بدلا۔ تینوں یکبارگی اس پر جھپٹے لیکن وہ جھکائی دے کر نکل گیا......''

اور یہ جملہ:

''......انسان سے بہتر شکاری کوئی نہیں تھا اور یہ مرغ بھی اب واضح طور پر تھک چکا تھا......''

('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۳۵)

آخر کار بھری عدالت میں مرغ گرفتار ہو گیا مشکیں کس دی گئیں، ذبح کرنے کی تیاری ہوگئی اور اب عدالت کی بلندی پر کھڑے جج صاحب نہ صرف تماش بین ہیں بلکہ ان کی زبان پر چلتا ہوا مرغ کے گوشت کا ذائقہ بھی ہے۔ لیکن مرغ کی بے بسی اور عدالت کے تقدس کے پیش نظر اچانک ان کا جذبہ انصاف جاگ اٹھا اور انہوں نے ڈانٹ کر مرغ کو آزاد کرا دیا۔ مرغ کی یہ آزادی اور اس کی آزادانہ پرواز ایک انمول جذبہ و احساس سے مالا مال کر گئی۔ نہ صرف جج کو بلکہ قاری کو بھی اور فن کی سرشاری کو بھی۔

لیکن ادب میں عدالتوں کے جج کی طرح فیصلے نہیں ہوتے۔ سائینس کی طرح فارمولے نہیں ہوتے۔ حساب کے پہاڑے نہیں بلکہ احساس کے ہیولے ہوتے ہیں۔ اضطراب کے شرارے جو انسان کی دردمندی غور وفکر کو بیدار کرتے ہیں۔ کئی روز سے گوشت کے ذائقہ سے محروم جج نے اپنے منصفانہ جذبے سے اپنے آپ کو اور قاری کو جس عمل سے گذارا اس سے ملنے والی تسکین دنیا کے تمام ذائقوں سے بلند و بالا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار یوں تو جج ہے لیکن حقیقتاً وہ مرغ ہے جو علامت ہے بے بسی، کمزوری کی اور آزادی کی بھی جسے افسانہ نگار نے نہایت فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جس میں ان کا مشاہدہ و تجربہ کچھ اس انداز سے مدغم ہو گیا ہے کہ کئی مقام پر قاری دم بخود رہ جاتا ہے اور یہی عنصر کسی فن پارے کا نقطہ عروج ہوا کرتا ہے۔

جان رسکن کا خیال ہے کہ آرٹ کا مقصد انسانی مقاصد کی تکمیل ہے۔ ہم ادب کو جن حوالوں اور زاویوں سے بھی پڑھیں اور سمجھیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ فن کا ادب وفن کے اخلاقی وانسانی پہلوؤں سے نظریں نہیں چرا سکتا، خاص طور پر ایسا ادب یا افسانوی ادب جو بیرونِ ذات یعنی افراد کی خارجی نقل وحرکت، تضاد وتصادم سے گہرا شغف رکھتا ہو۔ افسانوی ادب انسان اور انسانیت، اخلاقیات، جد و جہد حق و باطل کے درمیان واضح نقوش ثبت کرتا ہے اور خط امتیاز کھینچتا ہے۔ افسانہ نگار نے جس جدو جہد، تصادم اور کشاکش کو عدالت میں پیش کر کے جو پختگی و بالیدگی عطا کی ہے وہ بلراج بخشی کے ذہن اور ویژن کی نمائندگی کرتی ہے۔ بلاشبہ 'فیصلہ' ایک عمدہ کہانی ہے۔

ایک کہانی اور ہے 'ایک بوند زندگی'۔ نہایت رومانی عنوان لیکن کہانی اتنی ہی غیر رومانی۔ زندگی کی خواہش، تھکن اور فرار سے بھری کیفیت۔ ایک بے نام کی حقیقت جسے رومان تو کہا جا سکتا ہے لیکن ارادے کی مضبوطی، آنکھوں کی چمک اور زندگی کی حرکت وحرارت سے مالا مال بھی کیسے ہوئے۔ مسئلہ ہے انسان کی آزادی اور اس کے اعلان کا:

''......میں ان پابندیوں میں نہیں رہ سکتا...... مجھے جسم کی غلامی پر کوئی اعتراض نہیں مگر میں ذہن کی آزادی کو فراموش نہیں کر سکتا۔ مگر تم لوگوں نے تو اپنی روح تک گروی رکھ چھوڑی ہے........'' ('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۱۵۴)

اور سمجھوتہ نہ کرنے کے بعد کہانی کا مرکزی کردار، وہ خوددار انسان:

''......میں جا رہا ہوں...... سمجھوتہ نہیں کر سکتا......''

('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۱۵۵)

اور وہ جا رہا ہے انجان منزلوں کی طرف۔ آزادی کی طرف لیکن راہ میں مشکلیں، حملے اور آزادانہ خیالات کو چھین لینے والے پرندے۔ وہ جسمانی طور پر شل ہو جاتا ہے لیکن اس کے خیالات، ارادے نہیں تھکتے۔ بالآخر وہ پکڑ لیا جاتا ہے اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر پھر سے اس نظام کے تابع کرنے کی کوشش

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

کی جاتی ہے جس کے خلاف اس نے بغاوت کی تھی۔ اور وہ احتجاجاً چیخ اٹھتا ہے۔ ایک نوجوان اس سے متفق ہونے کے باوجود یہ کہہ کر اسے قتل کر دیتا ہے کہ میں نے تمہاری موت کو آسان کر دیا ورنہ یہ لوگ تمہیں تڑپا تڑپا کر مارتے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لیتے اور اس لیے:

''......یہ بنا درد موت تمہیں مبارک ہو دوست......'

('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۱۵۸)

کہانی کے مرکزی کردار نے آنے والی نسل میں آزادی کی جوت جگا دی۔ یہ زندگی، ایک بوند نہیں ایک سمندر ہے، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر آزادی کا، آرزوؤں کا تمناؤں کا، خوابوں کا اور حقیقتوں کا۔ ایک طبقہ کا عیش و آرام خواب چھین مارتا کا، اور لیتے ہیں اور حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں۔ اپنی فکر، اپنی تخلیقی قوت، پسند و ناپسند سے بہت دور چلے جاتے ہیں جیسا کہ آج کے صارفی سماج میں ہو گیا ہے کہ عام انسان اپنی تعمیری و تخلیقی قوتیں کھوتا ہوا میڈیا، اشتہار اور بازار میں جی رہا ہے، وہی کھا رہا ہے جو اسے کھلایا پلایا جا رہا ہے۔

کہانیاں اور بھی ہیں۔ اسی طرز کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی بصیرتوں سے پُر کہ بلراج بخشی نے اپنے دھار دار فن سے ان میں پسی ہوئی مرچ بھر دی ہے۔ سماجی سروکار اضطرابی و اضطراری کیفیتوں سے دوچار ہو گئے ہیں اور فن سے سمجھوتہ بھی نہ کے برابر ہے۔

بلراج بخشی جانتے ہیں کہ افسانہ اب اس حقیقت میں تبدیل ہو چکا ہے جہاں سماجی حقیقت اور گہرے تہذیبی و معاشرتی شعور کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ ایک زمانہ تھا جب کہانیوں میں تفریح کے عناصر زیادہ ہوتے تھے اور کہانیاں سُلانے کا کام کرتی تھیں۔ لیکن تاریخ اور وقت کے ساتھ یہ عمل رخصت ہو گیا۔ زمانے کے ساتھ کہانی نہ صرف سچ کو لے کر آگے بڑھی بلکہ جگانے کا کام کرنے لگی اور اب تو دو قدم مزید آگے بڑھ کر وہ صرف سچائیوں کو ہی پیش نہیں کرتی بلکہ ایک نئی سچائی کو جنم بھی دیتی ہے۔ بلراج بخشی کی ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ صرف واقعات نہیں محض situations نہیں بلکہ زندگی کے معاملات ہیں، تجربات اور احساسات ہیں، وہ مرحلے ہیں کہ جن سے جہان کی رنگارنگی، بوقلمونی تو ظاہر ہوتی ہے، بوالعجبی بھی کہ انسان کتنی صورتوں میں جیتا اور مرتا ہے۔ طاقت و دولت کے کیسے کیسے سفاک اور بے رحم روپ ہوتے ہیں۔

لیکن اچھی بات یہ ہے کہ بلراج بخشی کا ہر افسانہ، ہر کردار انسان اور اس کی حرکت و حرارت کے ساتھ ساتھ ہے اور حرمت و عظمت کے ساتھ بھی، امید و نشاط لے کر۔ آج کے حالات کے ساتھ جس میں ان کا نظریہ جاں اور نظریہ ادب دونوں واضح طور پر جھلکتے نظر آتے ہیں۔ سوال در سوال، فکر در فکر، اور کہیں کہیں فلسفہ بھی نظر آنے لگتا ہے کہ ڈی ایچ لارنس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ فکشن جب تک فلسفہ نہیں بن جاتا بڑا فکشن کہلائے جانے کا حقدار نہیں ہوتا۔ بلاشبہ ان کہانیوں میں فلسفہ جھانکتا ہے، فلسفہ زمینی اور فلسفہ انسانی، دونوں۔

رومان و وجدان پر باتیں بہت ہو چکیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اب براہ راست انسانی و معاشرتی حقائق پر باتیں ہوں، ان تخلیقات کی باتیں ہوں جن میں آج کا انسان اور آج کا ہندوستان زندہ ہے۔ اور اب تو عالمی جنگ و جدل کی بات کرنا بھی ضروری ہے کہ خون کہیں بھی ہے، انسان ہی کا بہتا ہے۔ اور انسان اگر اپنی عزت و حرمت کے ساتھ زندہ ہے تو تمام علوم و فنون ادب و جمالیات کا فلسفہ اور کہانیاں بھی زندہ رہے گی۔ لہٰذا اپنے ذہن و دل اور زور قلم کو تمام تر طاقت اور خلاقیت کے ساتھ حضرت انسان کی زندگی اور سلامتی کی سمت میں صرف کرنا اور انسان کو خوشحال دیکھنا ہی نہ صرف سب سے بڑا تصور جمال ہے بلکہ ادب و افسانوی ادب کا فریضہ اولین بھی۔ بلراج بخشی یہ فریضہ بخوبی ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

229-A, Luker Ganj
Allahabad (UP)-2110003
Mobile no. 9415306239

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بلراج بخشی اور 'ایک بوند زندگی'

■ دیپک بدکی، جموں کشمیر

بلراج بخشی کا جنم نگروٹہ جموں کے رفیوجی کیمپ میں ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہوا تھا۔ ان کے آباو اجداد پونچھ (مقبوضہ کشمیر) سے تعلق رکھتے ہیں۔ بی ایس سی کی ڈگری لینے کے بعد وہ صحافت سے جڑ گئے اور اس کے ساتھ ہی دوردرشن کے لیے اسکرپٹ رائٹنگ، پروڈکشن اور ڈائریکشن بھی کرتے رہے۔ انھیں اردو، ہندی، انگریزی، ڈوگری، پہاڑی، اور پنجابی (شاہ مکھی) کا علم تھا۔ افسانہ نگاری کے علاوہ انھیں شاعری، تنقید اور تحقیق سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کا شعری مجموعہ 'مرے گناہ سبھی' اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'رشحات' زیر اشاعت ہیں۔ بلراج بخشی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'ایک بوند زندگی' ۲۰۱۴ء میں اوشین پبلشنگ ہاؤس، اُدھم پور، جموں وکشمیر نے شائع کیا۔ ان کا پہلا افسانہ 'چاندی کا دھواں' ۱۹۶۹ء میں ماہنامہ 'شاعر' بمبئی میں شائع ہوا۔

بلراج بخشی لمبے عرصے تک تخلیقی عمل سے کنارہ کش رہے۔ اِس بات کا انھوں نے خود اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: ''۷۰ کے عشرے میں جب میں 'شب خون' کے ہتھے چڑھ گیا تو علامتی افسانے لکھنے لگا۔ چنانچہ اس قسم کے کئی افسانے 'شاعر، بمبئی'، تحریک'، دہلی اور کئی دوسرے رسائل میں شائع ہوئے۔ ہر جانب شب خون ازم کا شور بڑھتا گیا لیکن میری نسل پریم چند، منٹو، بیدی اور کرشن چندر کی نسل سے متاثر تھی۔ بہت جلد میں نے فیصلہ کیا کہ افسانوی یا شعری ادب کا Concept (تصور) ہی بدل گیا ہے جو کم سے کم میرے لیے بعید از فہم تھا۔ چنانچہ شمس الرحمٰن فاروقی سے خائف ہو کر میں نے کئی سال تک لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن آہستہ آہستہ شب خون ازم کی سطحیت اور لایعنیت سمجھ میں آنے لگی۔''

'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' اور 'مشترکہ اعلامیہ' افسانوں کے حوالے سے علی احمد فاطمی کا خیال ہے: ''کہانیاں اور بھی ہیں لیکن ان دو کہانیوں کے بارے میں، میں پورے تیقن کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس دور میں نئی اردو کہانیوں کی بھیڑ میں کم از کم میری نظر سے ایسی سماجی اور سیاسی نوعیت کی کہانیاں نہیں گزریں۔''

(ایک بوند زندگی۔ ص ۱۲)

بلراج بخشی خود کو پریم چند، منٹو، بیدی اور کرشن چندر کی روایت کا وارث سمجھتے ہیں۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ بلراج نے ایسے دور میں افسانے لکھنا شروع کیا جب جدیدیت کا بول بالا تھا لہٰذا ان کے فکر و اظہار پر اس تحریک کا کافی اثر پڑا ہوگا۔ ایسا ہوا بھی مگر انھیں اس اندازِ نگارش سے اطمینان اور تشفی نہیں ہو سکی اور انجام کار انھوں نے اپنا قلم اٹھا کر رکھ دیا۔ اس تعطل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں ان کے پہلے مجموعے کے لیے پینتالیس سال انتظار کرنا پڑا۔ خیر دیر آید درست آید۔ اس دورانیے میں موصوف کے مشاہدات میں وسعت اور تجربات میں پختگی پیدا ہو گئی اور اس مجموعی روئیدگی کا ثمر ہمارے سامنے 'ایک بوند زندگی' کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ بلراج بخشی کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں اعلیٰ پایہ کا طنز ملتا ہے جو تیکھا بھی ہے اور بر محل بھی۔ وہ سماج، رسم و رواج، سیاست اور افسر شاہی کو اپنی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ افسانہ 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' کا اختتام ہی طنزیہ لہجے کے ساتھ ہوتا ہے کہ ایک لاچار آدمی زندہ ہو کر بھی اپنی موت کی سند طلب کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح 'کیا نہیں ہو سکتا' میں سیاسی نظام پر بھرپور وار کیا گیا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

مجموعے کے پہلے افسانے کا عنوان 'فیصلہ' ہے۔ اس افسانے کے کئی ابعاد سامنے آتے ہیں۔ افسانہ نگار نے سنٹرل ایشیا اور ملی ٹنسی کا ذکر کر کے اس کی کڑیاں اس طرف بھی جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ چھٹپٹاتا 'مرغا' ملی ٹنٹ ہو سکتا ہے جو معاشرے میں کھلبلی مچا کر بالآخر عدالت میں پناہ لیتا ہے اور پھر چھوٹ جاتا ہے یا پھر وہ معصوم شہری ہو سکتا ہے جس کے پیچھے انتظامیہ محض شک کی بنا پر ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہے اور عدلیہ اس کا آخری سہارا بن جاتا ہے۔ افسانے میں بڑی ہنرمندی سے جج مظفر علی رانا کا کردار اور دور دراز علاقے، چھوٹا کشمیر کہے جانے والے بھدرواہ کے قدرتی مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جج کیس کے ساتھ لاشعوری طور پر وابستہ ہو کر بھی شعوری طور پر یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ غیر جانب دار نظر آئے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نفسی خواہش کے باوجود منصفی کی مجبوریوں کے تحت آخر کار مرغے کو بری کر دیتا ہے۔

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

افسانے میں طنز کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔جس کا ایک نمونہ مندرجہ ذیل فقرہ ہے:

''انسان سے یہ اس کی پہلی مڈبھیڑ تھی اور وہ اس نئے حریف کی جنگجویانہ صلاحیتوں سے قطعی نابلد تھا۔''

(ایک بوند زندگی۔صفحہ ۳۵)

افسانہ 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' کافکا کی کہانی 'دی ٹرائل' (The Trial) کی یاد دلاتا ہے۔یہ کہانی خود قلم کار کی سائکی کی ترجمانی کرتی ہے کہ کیسے اس نے اور اس جیسے ہزاروں لوگوں نے تقسیم ملک کے وقت اپنی جان جوکھم میں ڈال کر سرحد پار کی اور پھر اس پار سکونت اختیار کر لی مگر آج تک انھیں جموں وکشمیر ریاست میں، جوان کی پشتینی دھرتی ہے، شہری حقوق حاصل نہیں ہوئے۔بقول افسانہ نگار شناختی کارڈ ایک ایسی بنیادی دستاویز ہے جو ایک باشندے کی علاقائی، لسانی، مذہبی اور ثقافتی شناخت اور بلڈ گروپ کی تصدیق کرتا ہے یعنی ایک انسان کے جسمانی وجود کا ثبوت ہے۔اس افسانے میں مرکزی کردار کو شناختی کارڈ بنوانے کے لیے بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔سفید کالر افسر شاہی، جن کی گینڈے ایسی موٹی کھال پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا، اس کارروائی میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالتی ہے۔کئی اعتراضات کئے جاتے ہیں مثلاً درخواست دہندہ نے کچھ سال پہلے حکومت کے خلاف مظاہرے میں حصہ لیا تھا اور اس طرح طوائف الملو کی کا ساتھ دیا تھا۔علاوہ ازیں سائل نے ریوڑ چال سے اجتناب کر کے الیکشن میں ووٹ نہیں ڈالا جو اس کے غیر مقلد اور استحکام مخالف ہونے کا ثبوت ہے۔انجام کار درخواست گزار لال فیتہ شاہی سے تنگ آ کر مایوسی کی حالت میں کمشنر سے التجا کرتا ہے کہ کم سے کم اس کی ڈیتھ سرٹیفکیٹ ایشو کی جائے تا کہ اس کے اعقاب ضرورت پڑنے پر یہ بتا سکیں کہ وہ کسی شہری کے بچے ہیں جس کی کبھی موت رجسٹر ہوئی تھی۔افسانے میں افسر شاہی کے رعب داب، شان وشکوہ اور اپنے تئیں ضرورت سے زیادہ حفاظتی اقدامات کرنے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔اس افسانے میں بھی طنز کا خوب استعمال کیا گیا ہے یہاں تک کہ مرنے کی سند طلب کرنا بذاتِ خود انتظامیہ پر ایک بہت بڑا طنز ہے۔

افسانہ 'زچ' بانجھ پن پر تحریر کیا گیا افسانہ ہے جو مرد کی دھات میں حونیات منویہ کی غیر موجودگی (Azospermia) کے سبب واقع ہوئی ہے۔اس افسانے میں ایک لاولد جوڑے کی مجبوریاں اور لاچاریاں بیان کی گئی ہیں کہ کیسے انھیں ایک ڈاکٹر حمل نہ رہنے کے وجوہات سے آگاہ کرتا ہے اور انھیں جدید سائنسی تدابیر جیسے ٹیسٹ ٹیوب بے بی، کرائے کی کوکھ (Surrogacy) اور مصنوعی تخم ریزی (Artificial insemination) کی جانکاری دیتا ہے۔وہ انھیں آخر الذکر تدبیر اپنانے کی صلاح دیتا ہے لیکن ساحل کو یہ مشورہ اس لیے پسند نہیں آتا کہ نہ جانے کیسے آدمی کا تخم ہوگا اور کس طرح کی اولاد پیدا ہوگی۔اسے مہابھارت میں حلقۂ ازدواج سے باہر کسی غیر متعلق سے بچے پیدا کروانے اور ہندستان کی قدیم رسم 'نیوگ' کی بات یاد آتی ہے۔اس لیے وہ اپنی بیوی خوشبو کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی شناخت مسخ کر کے ہوٹل میں پڑوس میں رہ رہے ایک خوبصورت مرد سے مجامعت کرے۔مگر دونوں کے پورے کیے کرائے پر اس وقت پانی پھر جاتا ہے جب کئی بار کے اختلاط کے بعد اجنبی مرد خوشبو کو یہ بتاتا ہے کہ وہ موروثی بیماری کے سبب بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔اس افسانے میں قاری کو ساحل اور خوشبو کے کرداروں کے ساتھ فطری ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے کیونکہ افسانہ نگار نے نہ صرف ان کے بانجھ پن کی بڑی خوبی سے مصوری کی ہے بلکہ ان کے نفسیاتی تجسس کی بھی بڑی دقیقہ ریزی کے ساتھ عکاسی کی ہے۔اس کے علاوہ یہ افسانہ گلوبلائزیشن کے حوالے سے انسان کی مسخ شدہ شناخت اور بے چہرگی پر روشنی ڈالتا ہے۔جس کی رو سے صدیوں سے چلی آ رہی قدروں پر سوال اٹھ رہے ہیں۔موجودہ زمانے کے عملی فلسفے (Pragmaticism) کہ 'ذرائع کی فکر کیے بنا صرف انجام پر مرتکز ہونا چاہیے' کی بازگشت اس افسانے میں سنائی دیتی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

''سماجی منظوری گھٹیا افعال کو بھی مقصدیت کا جامہ پہنا کر اعلیٰ و ارفع بنا دیتی ہے، مقصد، ہمیشہ مقصد کو یاد رکھو....اعلیٰ مقصد...اس نے کہا تھا'' (ایک بوند زندگی۔صفحہ ۷۱)

'مشترکہ اعلامیہ' ہندستان و پاکستان کے باہمی تنازعوں اور نفرتوں میں پسے جا رہے غریب عوام کی ایک خوبصورت اور حساسیت سے بھرپور کہانی ہے۔جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کیسے جینوا سوئٹزرلینڈ کے آرام دہ ماحول میں رہ کر دونوں ملکوں کی افسر شاہی بین الاقوامی بدنامی کے مدنظر انسانی حقوق کی ان دیکھی کرتی

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

ہے اور دونوں طرف برسوں سے جیلوں میں بند قیدیوں کی دل سوز ایذا رسانی کو فراموش کر کے اور ان کے لواحقین کے احتجاج کو نظر انداز کر کے ان قیدیوں کے وجود ہی کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ آخر کار دونوں ممالک کی جانب سے ایک اعلامیہ جاری ہوتا ہے کہ پوری تفتیش کے بعد آج کی تاریخ میں آفیشل لسٹ کے علاوہ ان جیلوں میں اور کوئی قیدی نہیں پایا گیا۔ اس افسانے میں ایذا یافتہ دونفوس کی حالت زار کو بڑی ہنر مندی سے درشایا گیا ہے جس کے سامنے ہٹلر کے گیس چیمبر بھی شرمسار ہو سکتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کے بارے میں دونوں حکومتیں فرد کے دکھ درد کو بھول کر محض اجتماعی شماریاتی نظام کی بھول بھلیوں میں دنیا کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

"......پچھلے تین دن کی بحث کے بعد ہم سب مشترکہ طور پر متفق ہوئے ہیں...... کہ...... دونوں ممالک میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں ہوئی ہیں۔ دونوں ملکوں میں بلاضرورت محض کسی وحشی لذت کے حصول کے لیے بے بس قیدیوں پر تشدد کی انتہا کی گئی ہے جن کی حالت دیکھ کر ازمنہ وسطیٰ کے عقوبت خانوں کی یاد آجاتی ہے۔ جس کے لیے یقیناً انسانیت کا سر شرم سے جھک جانا چاہیے۔ لیکن جو بھی ہوا اس پر اظہار افسوس کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کی جاسکتی ہے جن کی اجازت سے یہ سب ہوا...... اس کمرے میں دونوں وفود کے تمام اراکین مشترکہ طور پر متفق ہیں کہ اس وحشیانہ تشدد کے شکاروں کو ان کے گھروں میں بھی واپس نہیں پہنچایا جاسکتا کیونکہ ان کے گھر والوں کو جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ گوشت کے ایسے لوتھڑے ملیں گے جو ہر قسم کے احساسات سے عاری ہو چکے ہیں ......اور پھر ان کے پبلک میں آنے سے دونوں ممالک کی بدنامی ہوگی۔ لہٰذا دونوں ممالک کے وسیع تر مفاد میں ہم سب نے مشترکہ فیصلہ کیا ہے کہ ان معلومات اور حقائق کو صیغۂ راز میں رکھا جائے۔" ('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۷۹)

افسانہ 'مکتی'، مخلصی موت (euthanasia) کا ہندستانی روپ ہے کہ ایک خاندان نسل در نسل ایسی بیماری (NCL) میں مبتلا ہے جس میں سبھی مرد جوانی ہی میں موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے گھر کی بڑی عورت آگے نسل کو روکنے اور مزید لڑکیوں کو قربانی کا بکرا بنا کر بیوہ بنانے سے بچانے کے لیے گرہن کے سماپت ہونے پر جل سمادھی (پانی میں ڈوب کر خودکشی کرنا) لیتی ہے۔ 'کیا نہیں ہوسکتا' افسانہ کم اور انشائیہ زیادہ ہے جس میں ہندستان کے سیاسی منظرنامے پر خوب طنز کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں اندرا گاندھی، من موہن سنگھ اور راہل گاندھی کی جانب اشارے ملتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سیاست دانوں نے آزادی کے بعد ہندستانی عوام کو بہلانے پھسلانے میں کیسا رول ادا کیا ہے، اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ افسانہ 'مکلاوہ' ریاست کے بلند پہاڑی وکنڈی علاقوں سے وابستہ بہت ہی پر اثر عشق کی المیہ کہانی ہے جس میں ٹھاکروں کی شجاعت اور دلیری داؤ پر لگ جاتی ہے اور آخر کار ایک غریب لاوارث نوکر اپنی جان کی بازی لگا کر پانی لے آتا ہے۔ جس کو دیکھ کر پالکی میں بیٹھی ٹھاکر کی دلہن حسب وعدہ نوکر کو اپنا پتی قبول کر کے اس کی لاش کے پاس اپنی چوڑیاں توڑ کر بیوگی اختیار کر لیتی ہے۔ افسانہ 'گرفتہ' موجودہ سماجی نظام پر طنز ہے اور پولیس کی کارستانیوں خصوصاً ان کے اتیاچاروں کی داستان ہے کہ کیسے وہ ہر روز عوام کو خواہ مخواہ پریشان کرتے رہتے ہیں۔ 'کھانسی ایک شام کی' کہانی ہے ایک ایسے والد کی جو باطن اپنے بچے کو بہت چاہتا ہے مگر اخروٹ کی مانند بظاہر بہت سخت نظر آتا ہے۔ افسانے کا عنوان افسانے کی سنجیدگی کو ہلکا کر دیتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائے:

"آپ جن اپنوں کی موجودگی، لمس اور قربت کے خواہش مند ہوتے ہیں اور ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں، ان کی ترجیحات میں آپ کہیں نہیں ہوتے۔"
('ایک بوند زندگی'، صفحہ ۱۳۴)

افسانہ 'ہارا ہوا محاذ' جنگلی شیروں پر مبنی کہانی ہے جس میں شیرنی پر حکومت کرنے کے لیے دو شیروں میں آپس میں جنگ ہوتی ہے اور وہی جیتتا ہے جو قدرے جوان اور طاقت ور ہوتا ہے۔ افسانہ ڈارون کے بقائے اہل کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ افسانہ کہانی سے زیادہ شیروں کا دائرۂ حیات معلوم ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس افسانے کی تحریک حیوانات سے متعلق کسی ٹی وی چینل سے ملی ہے۔ 'چور' پڑھ کر مجھے دھیرو بھائی امبانی کا ایک معروضہ یاد آیا جو اس نے انڈین ایکسپریس کے مالک رام ناتھ گوئینکا سے ایک روز کہا تھا کہ "ہر شخص کی ایمانداری کی ایک مقررہ حد ہوتی ہے، اس کے آگے لالچ دے کر اسے رام کیا جاسکتا ہے۔" افسانے میں دو لاکھ کی رقم پا کر مرکزی کردار کا ایمان ڈول جاتا ہے مگر بعد میں

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

پولیس کی یاتنائیں دیکھ کر اس کو ہوٹل کے ملازم پر رحم آتا ہے اور وہ اس کے گھر جاکر اسے نصف رقم کا ساجھے دار بناتا ہے۔ مجموعے کا آخری افسانہ 'ایک بوند زندگی' ہے جو علامتی افسانہ ہے اور جس میں باغی مرکزی کردار لوگوں کے قہر کا نشانہ بن جاتا ہے مگر اس کا ایک خیر خواہ اس کو مار کر اس کی موت آرام دہ بناتا ہے کیونکہ اس کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ زندہ رہ کر اس کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

بلراج بخشی کے افسانوں میں کرشن چندر کی مانند بڑی ہی باریک بینی سے منظر نگاری کی گئی ہے جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا مشاہدہ بہت ہی عمیق ہے۔ جموں و کشمیر کے پہاڑی علاقوں کے دلفریب مناظر جہاں ایک جانب قاری کا دل بہلاتے ہیں وہیں دوسری جانب دور افتادہ علاقوں کی زبوں حالی اور کریہہ مناظر دل دہلانے کے لیے کافی ہیں۔ مثال کے طور پر برفباری کی وجہ سے بھدرواہ جیسے دور دراز علاقے کا جموں یا اُدھم پور سے کٹ جانا اور اشیائے خوردنی کی قلت پیدا ہونا افسانہ 'فیصلہ' سرکاری دفتروں کی کارکردگی، افسر شاہی اور لال فیتہ شاہی کے دل شکن مناظر 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ'، ریاست کے کنڈی پہاڑی علاقوں کی جان لیوا اونچائیاں جہاں دو بوند پانی کے لیے لوگ ترستے ہیں 'مسکلاوہ'، جموں کی توی ندی کا دلکش منظر (مکتی) اور آبادی سے دور جنگل کا منظر 'ہارا ہوا محاذ' وغیرہ۔ افسانوں میں کردار نگاری بھی بڑی ہنروری سے کی گئی ہے۔ بخشی کے کردار ہمیں ارد گرد ہی گوشت پوست میں ملتے ہیں اور کسی ماورائی خصوصیت کے مالک نہیں ہیں۔ 'فیصلہ' کا جج منظر علی رانا، 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' کا راوی، 'مکتی' کی سیتا ونتی اور 'مسکلاوہ' کا رفلو چند یادگار کردار ہیں جو قاری کو متاثر کرتے ہیں۔

جہاں تک افسانہ نگار کے اسلوب کا سوال ہے، انھوں نے بیانیہ کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ وہ اپنے خیالات کا برملا اور واضح طور پر اظہار کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی تربیت جدیدیت کے دور میں ہوئی ہے اس لیے وہ اس لب و لہجے سے مکمل آزادی نہیں پا سکے ہیں۔ وہ علامتوں اور استعاروں کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' کا شناختی کارڈ، 'فیصلہ' کا مرغا وغیرہ استعارے بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح افسانہ 'ایک بوند زندگی' پوری طرح جدیدیت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ البتہ ان کے یہاں علامتیں یا استعارے چیستاں نہیں بن جاتے اور وہ ترسیل کے المیے کا شکار نہیں ہوتے۔ بلراج کی زبان بامحاورہ اور شگفتہ ہے حالانکہ انھوں نے انگریزی الفاظ کا بھی کافی جگہ استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان الفاظ کے متبادل اردو میں نہ ملے ہوں۔ بخشی کو اردو زبان سے جذباتی لگاؤ ہے۔

بلراج کے افسانوں میں چند غلطیاں اور کمیاں بھی نظر آئی ہیں۔ چند افسانوں میں غیر ضروری تفصیلات اور طویل منظر نگاری کی گئی ہے۔ منظر نگاری وہی اچھی لگتی ہے جو ناگزیر اور معنوی ہو ورنہ افسانہ محض تصنع اور زیبائش کا شکار ہو جاتا ہے۔ افسانے کا اصول یہ ہے کہ اس میں کفایت شعاری سے الفاظ کا کم سے کم استعمال ہو اور کوئی بھی لفظ ایسا نہ ہو جس کے نکالنے سے افسانے پر رتی بھر بھی اثر نہ پڑے۔ افسانہ 'فیصلہ' میں شیر چائے اور نون چائے کو دو قسم کی چائے (ص ۳۰) بتلایا گیا ہے جبکہ یہ ایک ہی چائے کے دو نام ہیں۔ ذیابطیس (ص ۲۹) کا صحیح املا ذیابیطس، 'سموار' (ص ۳۰) کا 'سماوار' یا 'سماور'، 'کاروائی' (ص ۷۹) کا 'کارروائی' اور 'بے تہاشہ' (ص ۱۵۴) کا بے تحاشہ ہے۔ 'ایک بوند زندگی' کے بارے میں ڈاکٹر مولا بخش فرماتے ہیں:

''اس مجموعے کے...... افسانے ...... قاری کو اپنے سحر میں لے لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ غیر ضروری تفاصیل کہیں کہیں کھٹکتی ہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ بلراج بخشی کہانی کہنے کی شعریات سے بھلی بھانتی واقف ہیں۔ وہ کہانی کو دکھانے کے علاوہ اسے قاری کی سائیکی کا حصہ بنا دینے کے فن سے بھی واقف ہیں۔'' (ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۲۴)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ بلراج بخشی نے اپنے افسانوں میں ہم عصر زندگی کو آئینہ دکھا دیا ہے۔ وہ اپنے معاشرے پر کڑی نظر رکھتے تھے اور ایک نئی سوچ و فکر کے نقیب تھے۔ 'ایک بوند زندگی' کے افسانوں سے افسانہ نگار کی مثبت سوچ و فکر کی آگہی ملتی ہے۔ وہ ایک صحتمند معاشرے کے متمنی تھے اور چاہتے تھے کہ فرد و جماعت دونوں کو نہ صرف معاشی اور اقتصادی آزادی حاصل ہو بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کی بھی مکمل آزادی ملے۔

☆☆☆

102-A, SG Impression, Sector 4B,
Vasundhara, Gaziabad- 201012

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بلراج بخشی اور ان کے افسانے

■ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پٹنہ

بلراج بخشی معاصر اردو افسانے کا ایک شناسا نام ہے۔ بلراج اگر چہ بہت زیادہ نہیں لکھتے تھے مگر جب بھی لکھتے پوری سنجیدگی کے ساتھ موضوع اور کہانی میں ڈوب کر لکھتے تھے۔ وہ خاموش مزاج، اور سادہ طبیعت کے حامل تھے۔ زندگی اور معاشرے میں مثبت اقدار کی تلاش کرتے اور اس کے فروغ کو ادب کا بنیادی مقصد سمجھتے تھے۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ قدروں کے زوال، فکری تضادات اور سماجی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتے بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج بھی اخذ کرتے تھے۔ وہ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کو بڑی فنی مہارت سے تخلیق کا درجہ دیتے اور کبھی کبھی تو معمولی واقعے یا خبر کو بھی کہانی بنا دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیوں میں ہمارے آس پاس کی سیاست اور زندگی اپنے تمام تر حُسن و قبح اور تضادات کے ساتھ نظر آتی ہیں۔

سعادت حسن منٹو نے کہا تھا کہ ''کوئی واقعہ جو افسانہ نگار کو متاثر کرے، اسے اسی اثر آفرینی کے ساتھ قاری تک ترسیل کردیا جائے، یہی افسانہ ہے''۔ بلراج بخشی کے افسانے اسی نقطۂ نظر اور جذبے کے حامل نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ یہ باور کرا دیتا ہے کہ انہوں نے محض شوق یا نام ونمود کی خاطر نہیں لکھا بلکہ وہ زندگی اور معاشرے کے مسائل و مصائب سے دوچار رہے اور انہوں نے زندگی اور سماج کے مطالعے میں جب زبردست دباؤ محسوس کیا تو اس کے اظہار کے لئے افسانہ کو ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ اس لئے ان کے افسانے سیدھے سادے، اور کبھی کبھی تہداری کے باوجود سلیس و سادہ ہیں۔ تمثیل و علامت ہے بھی تو مبہم اور پیچیدہ نہیں۔ وہ سب ایک ہی نشست میں پڑھوا لینے کی قوت رکھتے ہیں۔ افسانوں میں پلاٹ، کردار، مکالمے ہیں، انجام ہے، پیغام ہے۔ یعنی افسانے کا بنیادی ڈھانچہ پوری طرح موجود ہے۔ مثال کے طور پر رسائل میں شائع ہونے والے افسانوں سے قطع نظر صرف مجموعہ 'ایک بوند زندگی' کی کہانیوں کو سامنے رکھئے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ بلراج بخشی نے صرف بارہ کہانیوں میں زندگی کے متنوع پہلوؤں کو پیش کر کے کینوس کی وسعت کا بے پناہ خوبصورت مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں اگر ایک طرف فرد کی بے چارگی، معاشرے کا جبر اور قدروں کا زوال موضوع بنا ہے تو دوسری طرف اقتداری نظام کی بے بضاعتی، سماجی جکڑ بندی اور سیاست کی کراہت آمیز صورت حال بھی بڑی سچائی سے سامنے آتی ہے۔ وہ ان مسائل کی تصویر کشی میں مہارت رکھتے ہیں، انہیں پتہ ہوتا ہے کہ کس موضوع کو کس تکنیک سے بہتر طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے وہ کہیں علامتی، کہیں استعاراتی اور کہیں واضح بیانیہ سے کام لے کر اپنی کہانیوں کو غیر معمولی تاثر عطا کرتے ہیں۔ ان تمام تکنیکوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں طنز یعنی IRONY کا بڑا عنصر ہوتا ہے۔ مگر وہ Irony تلخی اور ترشی میں تبدیل نہیں ہوتی۔ ان کے جملوں کا طنز نشتر کی سی کاٹ رکھتا ہے اور بہت دیر تک قاری کو فکر کے سمندر میں غوطہ زن رکھتا ہے۔ 'مشترکہ اعلامیہ'، 'فیصلہ'، 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ'، 'زچ'، 'ایک بوند زندگی'، 'کیا نہیں ہوسکتا' اور 'ہارا ہوا محاذ' جیسے افسانوں میں طنز کی اس کاٹ کو بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

افسانہ 'کیا نہیں ہوسکتا' کو ہی لیجیے۔ وزیر اعظم نے اعلان کردیا کہ کل صبح سے ملک میں مہنگائی، کرپشن اور غریبی ختم ہو جائے گی۔ ملک کے عوام تجسس میں مبتلا ہیں کہ کل اچانک کیسے یہ تین بیماریاں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گی۔ ہر طرف بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہے۔ مگر دوسرے دن ایک قانون بنا کر وزیر اعظم لغت سے ان تینوں الفاظ کو نہ صرف غائب کرا دیتے ہیں بلکہ ایسے الفاظ کے استعمال کو خلاف قانون قرار دے دیتے ہیں۔ کہانی کے آخری جملوں میں طنز کی کاٹ اس طرح محسوس کی جاتی ہے۔

''جب یہ الفاظ کسی بھی ملکی زبان کی ڈکشنری میں ہی نہیں
تو ان الفاظ کو بولنا...... یا لکھنا...... خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔
لہٰذا...... یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ...... قانون بنا گیا ہے آج کے بعد
کوئی آدمی یا عورت ...... چھوٹا یا بڑا...... عوامی طور پر...... یا اپنے
گھر میں...... سنجیدگی سے...... طعنے کے طور پر یا مذاق میں بھی......
غریبی، مہنگائی اور کورپشن کے الفاظ منہ سے نہیں نکالے گا...... اور نہ ہی
لکھے گا۔ ایسا کرنا قابل دست اندازی پولس ہوگا۔ کوئی بھی آدمی اگر کسی
کے خلاف تحریری شکایت کرے گا کہ اس نے اپنے منہ سے ان تینوں

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

میں سے کسی لفظ کو نکالا ہے یا لکھا ہے تو ملزم کو خود ہی ثابت کرنا پڑے گا کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہے...... ان تینوں الفاظ میں سے کسی کو بھی منہ سے نکالنا یا لکھنا ملک کے خلاف غداری ہوگی...... اور یہ جرم...... ملک کو بدنام کرنے والا یہ گھناؤنا جرم...... ایک سنگین جرم سمجھا جائے گا۔'' (ایک بوند زندگی۔صفحہ ۱۰۰)

گویا وزیراعظم نے جس طرح ریلوے کی تھرڈ کلاس کی جگہ سیکنڈ کلاس کے بورڈ لگوا کر لوگوں کا معیار زندگی اچانک بلند کر دیا تھا اسی طرح ڈکشنری سے غریبی، کرپشن اور مہنگائی کے الفاظ ہٹا کر ملک سے ان برائیوں کو جڑ سے مٹا دیا۔ افسانے میں طنزیہ پیرایہ اپنا کر بڑی خوبصورتی سے بتایا گیا ہے کہ اس اندھیر نگری میں کچھ بھی ممکن ہے۔

'مشترکہ اعلامیہ' کا Irony سے بھرپور متن بھی ہمیں ایسے ہی حیرت انگیز انجام سے چونکا تا ہے۔ یہاں کہانی ہند و پاک کی جیلوں میں بند عام انسانوں کو نگاہ میں رکھ کر بنی گئی ہے، جس کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ انسان خواہ کسی خطے کا ہو اس کا درد یکساں ہے، اس کے مسائل یکساں ہیں، اور سیاست ہر جگہ انسان کا استحصال یکساں کرتی ہے۔ ایک عالیشان ایرکنڈیشنڈ بلڈنگ میں ہندستان اور پاکستان کے اعلیٰ افسروں کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ ایک طرف راؤ رتن سنگھ اور دوسری طرف پیرزادہ نصرت یار خاں۔ دونوں انسانی حقوق، انسانی اقدار اور عدل وانصاف پر اعلیٰ قسم کی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن جب براہ راست قیدیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو قیدیوں کی کربناک حالت دیکھ کر انسانیت کی روح کانپ جاتی ہے۔ سب کے چہرے فق ہو جاتے ہیں اور کسی کو یقین نہیں آتا کہ کسی انسان کی یہ ہیئت بھی بن سکتی ہے۔ صرف ہڈیوں کے ڈھانچے بھی شاید ان سے بہتر دکھائی دیتے ہوں گے۔ یہ حال دونوں طرف کے قیدیوں کا تھا مگر دونوں ملکوں کے نمائندے، یہ افسران راؤ اور خان، بالکل شرمندہ نہیں ہوتے۔ ممبران کو پہلے غصہ آتا ہے مگر ایک مخصوص نظام کے زیر اثر غصہ اتنی ہی جلدی غائب بھی ہو جاتا ہے۔ اور پھر دونوں ممالک کے وسیع تر مفاد میں مشترکہ فیصلہ لیا جاتا ہے کہ ان معلومات اور حقائق کو صیغۂ راز میں رکھا جائے۔ افسانے کا آخری حصہ دیکھیے جو طنز کی تیز دھارا اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

''پیرزادہ نصرت یار خان نے خندہ پیشانی سے کہا۔ اس کے علاوہ آپ کے تعاون، معاملہ فہمی اور ملک کے وسیع تر مفاد کو ترجیح دینے کے آپ کے میلان کو ملحوظ رکھتے ہوئے...... حضرات...... آپ کی اپنی اپنی حکومت...... شکرانے کے طور پر آپ کو حقیر سا تحفہ بھی دیتی ہے...... جو...... ہوٹیل میں آپ کے کمروں میں رکھے ایک بریف کیس میں آپ کا انتظار کر رہا ہے...... سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔'' (ایک بوند زندگی۔صفحہ ۷۵)

سارا کا سارا کاروبار ہے۔ یہاں نہ حقوق انسانی سے کسی کو مطلب ہے اور نہ قیدیوں کی حالت زار میں سدھار کی فکر۔ ایک اور کہانی ہے 'فیصلہ'۔ جو ایک مرغ کو دوڑا دوڑا کر پکڑنے اور پھر اسے چھوڑ دینے کی کہانی ہے۔ یہاں مرغ اس عام آدمی کی علامت ہے جو سیاست، معاشرتی جبر اور کشمیر کے حالات میں قیدی کی طرح جینے پر مجبور ہے اور انتظار کر رہا ہے اس منصف کا جو اسے آزاد کر کے سکون سے جینے کا حق عطا کردے۔ جج مظفر علی رانا امید کی کرن کے طور پر کہانی میں موجود ہیں جو یقین دلاتے ہیں کہ جب تک عدلیہ ہے انسان بہت حد تک محفوظ ہے۔ مرغ کو موت سے بچانے کی جدوجہد موجودہ حالات میں بڑی معنویت رکھتی ہے۔ مرغ کی چھٹپٹاہٹ دراصل عام آدمی کی چھٹپٹاہٹ ہے جس کی چیخ سے آواز چھین لی گئی ہے اور اسے زبردستی قید کر کے یقینی موت (خاتمے) کی طرف دھکیلنے میں اقتداری نظام مستعد ہے۔ ایسے میں جج یعنی سرگرم عدلیہ کا یہ فیصلہ انسان کے لیے اندھیرے میں ایک روشن مینارہ ہی دکھائی دیتا ہے۔

''پھر جب سلیمان اس کے گلے پر چھری پھیرنے ہی والا تھا کہ رانا بے اختیار چیخ پڑا ''ٹھہرو'' سلیمان نے ہاتھ روک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''اسے چھوڑ دو......'' سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

''اسے چھوڑ دو......'' جج رانا نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''یہ عدالت ہے ذبح خانہ نہیں۔''

(ایک بوند زندگی۔صفحہ ۳۷)

ظاہر ہے مرغ کے لئے رانا فرشتۂ رحمت ثابت ہوتا ہے۔ یعنی انسان کی آخری امید اب عدلیہ ہی ہے۔ اسی لیے تو مرغ جاتے ہوئے بار بار صرف رانا کو ہی دیکھ رہا ہوتا ہے۔

''کیا یہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔'' رانا نے سوچا''......

اوہ یہ تو واقعی میری طرف دیکھ رہا ہے۔'' رانا نے حیرت سے سوچا۔

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

(ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۳۷)

اور پھر کہانی کا انجام بہت معنی خیز طور پر ہوتا ہے جہاں ایک کیس ختم ہوتا ہے اور دوسرا شروع۔

''وہ واپس مڑ کر عدالت کے منبر پر آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر جب سبھی لوگ کمرۂ عدالت سے باہر چلے گئے تو کورٹ کلرک سے بولا: ''نیکسٹ کیس!'' (ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۳۸)

یہ کہانی بھی اپنے درون میں کشمیری صورت حال اور سیاسی تگ ودو پر طنز ہی ہے۔ اقتداری نظام کی بے بضاعتی اور شناخت سے محروم آج کے انسان کی بے بسی پر ایک اور طنزیہ کہانی ''ڈیتھ سیرٹیفیکیٹ'' بھی بڑی فن کاری سے بنی گئی ہے۔ یہ ایسی کہانی ہے جہاں انسان ایک کردار کے روپ میں شناخت سے بھی محروم ہے۔ وہ اس معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے بھی محض ایک اکائی بن کر رہ گیا ہے۔ ایک ٹریولنگ سیلز مین یعنی عام آدمی اپنا شناختی کارڈ بنوانے کے لیے کمشنر کورٹ درخواست دیتا ہے لیکن دفتری ضابطوں میں وہ اس طرح الجھا دیا جاتا ہے کہ اس کے لیے شناختی کارڈ حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی شناخت کا ثبوت مانگنے گیا تھا اور دفتری قانون اس سے ہی 'ہونے'' کا ثبوت مانگ بیٹھتا ہے۔ جسمانی وجود ہوتے ہوئے بھی سیلز مین کے ''ہونے'' کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملتا اور اس لئے اس کا آئیڈنٹٹی کارڈ نہیں بن سکتا۔ قانون شکنی، قانون کے نام پر عام انسان کی دفتروں میں ذلت اور فائلوں پر ٹکے انتظامیہ کی کریہہ صورتیں افسانے میں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس ملک میں جینے، کمانے اور اپنے ہونے کا ثبوت دینے کے لیے آئیڈنٹٹی کارڈ ضروری ہے۔ اپنے ہی ملک میں ایک کارڈ کی عدم موجودگی کی وجہ سے شناخت سے محروم ہو جانے کا المیہ کتنا بڑا المیہ ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور پھر تھک ہار کر جب وہ سیلز مین شناختی کارڈ نہ ملنے پر زندہ رہتے ہوئے اپنا ڈیتھ سرٹیفیکیٹ حاصل کرنے کی استدعا کرتا ہے تو اس نظام کا المیہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ کہانی کے آخری جملے دیکھیے جس میں اس سسٹم پر طنز کی کاٹ تیز دھار کی طرح قاری کے سینے کو چھید جاتی ہے:

''میرے دو بچے بھی ہیں جناب..... کل انہیں بھی اسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔ 'میں نہیں چاہتا کہ انہیں بھی کبھی اس اذیت سے گزرنا پڑے۔ چونکہ مطلوبہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہنے پر یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ میں ......ہوں......اگر ڈیتھ سرٹیفیکیٹ مل جائے تو...... بعد از مرگ تو میری آئیڈنٹٹی بہ آسانی ثابت ہو جائے گی...... کہ...... میں بھی...... تھا...... اور ڈیتھ سرٹیفیکیٹ...... ایک سرکاری دستاویز...... ہو سکتا ہے ان کے کسی کام آ جائے۔'' (ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۴۵)

یہ کہانی نہ صرف مصنف کی فنکاری کا ثبوت دیتی ہے کہ کس طرح فن کار اشاروں کنایوں میں بھی حقیقت نگاری کا عمدہ مظاہرہ کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ہمارے سسٹم پر بھی کاری طنز ہے جہاں عام انسان اصول وضوابط کے نام پر اپنی پوری زندگی فائلوں کے گورکھ دھندے میں کھو دیتا ہے اور اس سسٹم کے ذریعہ اس قدر ذلیل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنے مرنے کی تصدیق چاہنے لگتا ہے۔

بلراج بخشی نے سیاسی، سماجی اور حقوق انسانی پر مبنی افسانوں کے علاوہ بھی کچھ ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو ان کی فنکاری کی نئی جہتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ مثلاً 'مکلاوہ' جس کی بنیاد اُدھم پور کی ایک لوک کتھا پر رکھی گئی ہے۔ یا 'ایک بوند زندگی' جو زندگی کی خواہش اور فرار سے بھری کیفیت کی نفسیاتی عکاسی کرتی ہے۔ یا 'مکتی' جہاں عورت کا کرب اپنی انتہا پر نظر آتا ہے۔ اور ایک اہم کہانی 'زچ' جس میں انسانی نفسیات کا بڑا بھرپور مطالعہ سامنے آتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ یہاں بھی افسانہ نگار بباطن انسان کی جبلت پر طنز ہی کرتا دکھائی دیتا ہے کہ انسان خواہ کتنی کوشش کر لے وہ قدرت اور مقدر سے نہیں لڑ سکتا۔ وہ قدروں کی پامالی کے لیے جواز ڈھونڈ سکتا ہے، اپنی خواہشات کی تکمیل کے راستے گڑھ سکتا ہے، مگر ہوتا وہی ہے جو قدرت نے اس کی قسمت میں لکھ رکھا ہے۔ مرد اور عورت دونوں بچے کے خواہش مند ہیں۔ عورت تو صبر کر سکتی ہے مگر مرد خواہش کی تکمیل کے راستے ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ وہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے مطمئن نہیں اس لیے چاہتا ہے کہ اس کی بیوی خود سے ملتے جلتے کسی شخص سے رشتہ قائم کرے۔ بیوی راضی نہیں مگر مرد پانڈووں کا حوالہ دے کر اسے اساطیر کے دھاگے سے باندھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس پر بھی بیوی تیار نہیں ہوتی تو اسے نیوگ کا قدیم سسٹم یاد دلاتا ہے جس کے تحت حصول اولاد کے لیے عورت کو کسی دوسرے مرد کے پاس بھیجا جا سکتا تھا۔ بالآخر بیوی راضی ہو

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

جاتی ہے اور ایک مرد بھی مل جاتا ہے جو اس کے شوہر سے ملتا جلتا ہے۔ ساگر کے ساتھ خوشبو اپنے پورے جذبات کے ساتھ ہم بستر ہوتی ہے، مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ ساگر کی تلاش، اس کے ساتھ ہم بستری اور زن وشو دونوں کے جذبات کی قربانی اس وقت رائیگاں ہو جاتی ہے جب کہانی کے بالکل آخر میں خوشبو کو پتہ چلتا ہے کہ بظاہر نارمل دکھنے والے ساگر کے اندر بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ بالکل اس کے شوہر کی طرح جو سیکس میں تو نارمل ہے مگر sperm پیدا کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ افسانہ قاری کو اختتام میں چونکاتا ہی نہیں اسے کئی قسم کے احساسات اور سوالات سے بھی دوچار کرتا ہے۔ انجام پر ایک نظر آپ بھی ڈالیے:

''خوشبو نے حسب معمول وٹامن کی گولی منہ میں ڈال کر پانی کے دو گھونٹ پیے اور گلاس میز پر رکھا۔

''یہ تم ہر بار کون سی ٹیبلیٹ لیتی ہو'' ساگر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کیوں...... میں نے بتایا نہیں تھا کہ ابھی میں Pregnant نہیں ہونا چاہتی...... خوشبو نے اسے بتایا کہ یہ مانع حمل گولی ہے۔

''پھر تم بے کار ہی ڈر رہی ہو'' ساگر نے کپڑے پہنتے ہوئے ہنس کر کہا ''مجھ سے پوچھ لیا ہوتا''

''کیا مطلب......؟''

ساحل نے گلاس ہونٹوں سے الگ کیا اور غور سے سننے لگا۔

''یہ...... میرے ساتھ...... ایک عجیب ٹریجڈی ہے نیلم''

ساگر اچانک اداس ہو گیا اور غمناک لہجے میں کہنے لگا

''میری سیکس لائف بالکل نارمل ہے...... مگر...... مجھ میں اسپرم پیدا کرنے کی اہلیت نہیں ہے...... یہ ایک بہت Rare میڈیکل کنڈیشن ہے...... جسے...... چھوڑو...... تم نہیں سمجھو گی...... بس یوں سمجھ لو...... کہ...... میں بچہ پیدا نہیں کر سکتا۔

''کیا......؟'' خوشبو سکتے میں آ گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خوشبو کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔'' (ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۷۳)

افسانے کا یہ المناک انجام انسان اور اس کی مصنوعی کوششوں پر طنز ہے کہ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ انسان لاکھ کوششیں کر لے وہ قدرت کی مرضی کے خلاف جا ہی نہیں سکتا۔ انسان اپنے ہوس اور خواہشات کی تکمیل کے لیے خواہ مخواہ اخلاقی پیمانوں اور قدروں کو قربان کرتا رہتا ہے۔

انسانی، سماجی اور معاشرتی نفسیات کا مطالعہ بلراج بخشی کے پاس زبردست ہے اس لیے جب وہ اس نفسیات میں تھوڑی سی بھی کجی دیکھتے تھے تو ان کے لبوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ جاگ اٹھتی تھی اور پھر ان کا قلم اس طنز کو کہانی کے پیرائے میں پیش کر کے قاری تک بڑی خوبصورتی سے پہنچا دیتا تھا۔ مذکورہ افسانوں کے علاوہ بھی ان کے زیادہ تر افسانے قاری کو اپنے انجام پر نہ صرف چونکاتے ہیں بلکہ ایک طنزیہ اختتام سے اسے سحر میں لے لیتے ہیں۔ 'ہارا ہوا محاذ'، 'مکلاوہ'، 'گرفتہ'، 'چور' اور 'مکتی' جیسے افسانے میری اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔

مذکورہ افسانوں پر مختصر گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ بلراج بخشی گہرے سماجی مطالعے کے بعد اُن حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے کو متاثر کر رہے ہیں۔ یہ حقائق چھوٹے چھوٹے معمولی اور نظر انداز کرنے کے قابل واقعات یا خبروں کی نفسیات سے پیدا ہوتے ہیں۔ کسی معمولی واقعے یا خبر کو کہانی بنانے کا فن ایک کہنہ مشق فنکار ہی کر سکتا ہے۔ بلراج بخشی نفسیاتی اور طنزیہ کہانیاں لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں اور کسی معمولی واقعے یا خبر کی نفسیات کو اس طرح کہانی کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں کہ وہ دو آتشہ بن کر امر ہو جاتی ہے اور فنی شہ پارہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ افسانے میں موضوع اہم مسئلہ ہے مگر اس سے بڑا اور اہم مسئلہ موضوع کے ساتھ افسانہ نگار کے برتاؤ اور ٹریٹمنٹ کا ہے۔ برتاؤ سے میری مراد کہانی کہنے کا فن ہے۔ بلراج بخشی بہر حال کہانی کہنے کے فن سے واقف ہیں۔ وہ موضوع کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پلاٹ بہت مربوط ہوتا ہے۔ وہ بے جا طوالت سے بھی گریز کرتے ہیں اور عبارت میں الجھاؤ پیدا نہیں ہونے دیتے۔ زبان وبیان پر قدرت کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے افسانے اپنی شگفتگی، سلاست، روانی اور برجستگی کی وجہ سے ایک نشست میں پڑھوا لینے کی قوت رکھتے ہیں۔ اور یہی ایک افسانہ نگار کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔

☆☆☆

Deptt. of Urdu Patna University
Patna-800005
Mobile No.8863968168

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بلراج بخشی کا فکری وفنی کینوس

■ڈاکٹر مشتاق صدف، علی گڑھ

بلراج بخشی ایک معتبر اور صاف ستھرے کہانی کار ہیں۔ وہ کہانی کو کہانی کی طرح پیش کرتے ہیں۔ وہ ہمیں کسی فریب میں الجھاتے نہیں اور نہ خود الجھتے ہیں بلکہ کہانی کو بڑی معصومیت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں اور اسی لیے ان کی کہانیوں میں حسن آفرینی اور حقیقت پسندی کی فضا کا احساس ہوتا ہے جو انہیں انفراد بخشتا ہے۔ وہ ایک کشادہ دل اور کشادہ نظر تخلیق کار ہیں جو زندگی کی نامیاتی وحدت کو ہمیشہ مختلف النوع ابعاد کی شکل میں دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع کو تہ در تہ کھنگال کر زندگی کے چھوٹے چھوٹے پریشان کن مسائل پر بڑی سنجیدگی سے کہانیاں لکھتے ہیں۔ سماج کے لاشعور سے مکالمے میں ان کی خاصی دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں جذبہ واحساس کی کارفرمائی بھی ہر جگہ دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ ان کے یہاں ایک طرف موضوع کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف تازگی وشگفتگی کا احساس بھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانی دلچسپ اور پر کشش فن پارہ بن جاتی ہے۔

ان کی کہانیوں کا دائرہ وسیع ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی دونوں طرح کے مسائل وموضوعات پر ان کی گہری نظر ہے۔ زندگی سے موضوعات چنتے ہیں اور اپنی فکر سے اسے روشن کر کے اس کے رنگوں کو اس طرح ابھارتے ہیں کہ زندگی کی اصل شکل ہمارے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ ان کی کئی کہانیاں کتابی شکل میں آنے سے پہلے ہی مقبول ہو چکی ہیں۔ 'ڈیتھ سٹیفکیٹ'، 'فیصلہ'، 'مشترکہ اعلامیہ'، 'ہارا ہوا محاذ'، 'زچ' اور 'ایک بوند زندگی' ان کی عمدہ کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کی پیش کش کے انداز میں جدت بھی ہے اور تازگی بھی۔ ان کی کہانیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید زندگی اور اس کے مسائل کسی قدر تشویشناک ہیں۔ موجودہ عہد کی کشاکش، بے ایمانی، ناانصافی اور فرد کی شناخت کا مسئلہ کتنا پیچیدہ ہے۔ کہانی 'فیصلہ' میں لحاف، برف، سگریٹ، عدالت، درخت، جھاڑیاں، سوکھے پتے، جنگلی مرغ اور اس کے پنکھ جیسے الفاظ کے استعمال سے علامتی کہانی نہ ہوتے ہوئے بھی یہ علامتی ہو گئی ہے۔

غنیمت ہے کہ کہیں کچھ تو محفوظ ہے۔ کہیں کچھ تو امید کی کرن ہے۔ جج مظفر علی رانا اور جنگلی مرغ کے درمیان جو زندگی کی اصل کہانی ہے وہ فیصلہ میں موجود ہے۔ جنگلی مرغ کو یقینی موت سے بچانے کی بات آج کے عہد میں بڑی معنویت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کہانی کا اختتام ایک کیس کے نمٹنے اور نیکسٹ کیس کے آغاز سے ہوتا ہے جو بہت معنی خیز ہے۔ 'فیصلہ' کے مرغ کی چھپٹاہٹ اصل میں عام آدمی کی بے صدا چیخ ہے۔ کہانی میں جج اور مرغ کی علامتوں کو ڈی کوڈ کرنے کے بعد نہ جانے کیوں یہ احساس ہوتا ہے کہ بلراج بخشی کے نزدیک اقتداری نظام کے چنگل سے عام آدمی کے نکل جانے کے امکانات بری طرح معدوم ہو چکے ہیں اور اب ایک مستعد اور سرگرم عدلیہ ہی عام آدمی کو راحت دے سکتی ہے۔

'مشترکہ اعلامیہ' کا موضوع کوئی نیا نہیں ہے لیکن اس کی حساسیت میں ایک نیا انداز ضرور ہے۔ انسانی حقوق کی پائمالی کہاں نہیں ہو رہی ہے، کتنے معصوم اور بے گناہوں کو جیلوں میں قید کیا جاتا ہے، سیاست کس طرح انسانیت کا خون کر رہی ہے، یہ کہانی ان سوالوں کا جواب فراہم کرتی ہے۔ 'مشترکہ اعلامیہ' حکومتی نظام کی فریب کاریوں کی عمدہ مثال ہے۔ ہندوستان کی جیلوں میں بند پاکستانی قیدیوں اور پاکستان کی جیلوں میں بند ہندستانی قیدیوں کی حالت زار پر مبنی یہ کہانی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ کہانی بیان کرتی ہے کہ سیاست کا رول کتنا گھناؤنا ہو سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے پوری انسانیت ایک بریف کیس میں بند ہو چکی ہے، دستخط بھی کتنے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور اب فقط دکھاوے ہی دکھاوے ہیں۔

بلراج بخشی کی خوبی یہ ہے کہ کہانی کے اختتام میں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ 'مشترکہ اعلامیہ' کا آخری جملہ دیکھیے کتنا پُر اثر ہے: ''پیرزادہ نصرت یار خان نے خندہ پیشانی سے کہا: ''اس کے علاوہ آپ کے تعاون، معاملہ فہمی اور ملک کے وسیع تر مفاد کو ترجیح دینے کے آپ کے میلان کو ملحوظ رکھتے ہوئے...... حضرات...... آپ کی اپنی اپنی حکومت...... شکرانے کے طور پر آپ کو ایک حقیر ساتحفہ بھی دیتی ہے...... وہ...... ہوٹیل میں آپ کے اپنے اپنے کمروں میں رکھے...... ایک بریف کیس میں آپ کا

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

انتظار کررہا ہے۔ سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔" (صفحہ ۸۰)

'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' سماجی حقیقت پر مبنی بلراج بخشی کی ایک ایسی کہانی ہے جس کے معنیاتی انسلاکات پر سے پردہ اٹھانے کی سخت ضرورت ہے۔ اس سے اقتداری نظام کی بے بضاعتی اجاگر ہوتی ہے۔ یہ دراصل ایک انسان کی شناخت کی کہانی ہے، ایک ایسے انسان کی کہانی جو اپنی شناخت چاہتا ہے۔ ایک ایسے انسان کی شناخت جس کا سراپا وجود تو ہے لیکن شناخت مشکوک ہوگئی ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ آج کا فرد، وجود رکھتے ہوئے بھی اپنی شناخت سے محروم ہو کر محض ایک حیاتیاتی اکائی بن کر رہ گیا ہے۔ کہانی کا ڈھانچہ عام ہے لیکن موضوع کی معنویت گہری ہے۔ ایک ٹریولنگ سیلز مین اپنا آئیڈنٹی کارڈ بنوانے کے لیے کمشنر کو عرضی دیتا ہے لیکن دفتری ضابطوں میں گھرا ہوا کمشنر اس کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ جسمانی وجود کے ہوتے ہوئے بھی سیلز مین کے ہونے کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملتا اور اس لیے اس کا شناختی کارڈ نہیں بن سکتا۔ قانون شکنی ہر جگہ نظر آتی ہے، یہ اور بات ہے لیکن ایک شخص جسے جینے کے لیے روٹی چاہیے اور اس روٹی کے لیے شناختی کارڈ ضروری ہے، جو اسے نہیں مل سکتا۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہ اس عظیم ملک کا شہری ضرور ہے لیکن اس کا حصہ دار کہلانے کا حق اسے نہیں دیا جاسکتا۔ اپنے ہی ملک میں اپنی شناخت سے محروم ہوجانے سے بڑا المیہ کیا ہوگا۔ اور پھر شناختی کارڈ نہ ملنے پر جب ایک زندہ شخص اپنے ہی ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو حاصل کرنے کی استدعا کرتا ہے تو بے بسی کی یہ انتہا ہمارے سسٹم کی بے حسی کی غماز بن جاتی ہے جس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔

کہانی کا اختتام نظام اور فرد کے رشتے پر ایک ایسا سوالیہ نشان قائم کرتا ہے کہ مرکزی کردار کی یہ آخری بات ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے: "میرے دو بچے بھی ہیں جناب! کل انہیں بھی اسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے...... اس نے لجاجت سے کہا میں نہیں چاہتا کہ انہیں بھی کبھی اس اذیت سے گزرنا پڑے...... چونکہ مطلوبہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہنے پر یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ میں...... ہوں...... اگر ڈیتھ سرٹیفکیٹ مل جائے تو...... بعد از مرگ تو میری آئیڈنٹی بہ آسانی ثابت ہوجائے گی کہ میں کبھی تھا اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ...... ایک سرکاری دستاویز ہوسکتا ہے ان کے کسی کام آجائے......" (ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۴۵)

اس کہانی میں حقیقت نگاری ہے۔ بلراج بخشی کو بیانیہ پر مہارت حاصل ہے۔ وہ کم لفظوں میں بہت کچھ کہہ دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ اظہار کا وہ رویہ ہے جو بڑے فنکاروں کے یہاں ملتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ کہانی ترقی پسندی کے عہد میں لکھی گئی ہوتی تو پند و نصاح کے دفتر کھول دیے گئے ہوتے اور مقصدی پہلو غالب آگیا ہوتا۔ لیکن یہ کہانی اکیسویں صدی میں لکھی گئی ہے اور اس لیے اس میں نصیحت یا مقصدیت نہیں ہے بلکہ متن میں کثرت تعبیر ہے۔ یہ آج کا نیا افسانہ ہے اس لیے اس میں حقیقت نگاری کا میکانکی اور غیر تخلیقی رویہ نہیں ملتا۔ یہ کہانی ہمارے اقتداری نظام کے اصول وضوابط پر بھی ایک بڑا طنز ہے۔

دراصل بلراج بخشی ایک ایسے فنکار ہیں جنہیں بیانیہ کے انسلاکات پر دسترس حاصل ہے اور یہ خوبی 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' میں بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔ ان کی کم وبیش تمام کہانیوں میں معنیاتی تہہ داری کا احساس ہوتا ہے اور یہی ان کا اختصاص بھی ہے۔ وہ کسی نظریے کے بجائے اپنی تخلیقی بصیرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی ایک مخصوص تکنیک یہ ہے کہ افسانے کے اختتامی جملوں کو انتہائی پُر اثر بنادیتے ہیں جو ایسا خلا چھوڑ دیتے ہیں کہ قاری کا ذہن متحرک ہو کر معنی کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ کہانی اور قاری کے درمیان بلراج بخشی کہیں نظر نہیں آتے اور نہ ہی وہ کرداروں کی لگام ہاتھ میں لیے دکھائی دیتے ہیں بلکہ ان کے کردار کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ 'ہارا ہوا محاذ' ان کی فنی چابکدستی کی بہترین مثال ہے۔

بلراج بخشی نے اپنی کہانیوں میں سادہ، سلیس اور بے باک طریقہ اظہار کو برتا ہے۔ انہوں نے جہاں اقتداری نظام کی بے بضاعتی کو اجاگر کیا ہے وہیں سماجی جکڑبندیوں پر طنز کے ساتھ اقدار کی بحالی اور معاشرے کے جبر سے فرد کی آزادی پر بھی اصرار کیا ہے۔ وہ ایسے ایسے نازک موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں اور انہیں اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کے فکر وخیال کی دنیا میں ہلچل پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جن کے پیش نظر کوئی نقاد بلراج بخشی کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

☆☆☆

Aligarh Muslim University Aligarh UP-202002

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بلراج بخشی کے شعری رویّے

■ڈاکٹر الطاف انجم

بیسویں صدی میں شاعروں اور فنکاروں کی ایک کہکشاں ہمارے سامنے آئی ہے، جنہوں نے اپنے اپنے میدان میں اَن مِٹ نقوش ثبت کیے۔ ربع آخر میں جو شعرا منصۂ شہود پر آئے اُن میں بلراج بخشی بھی ہیں۔

ہندوستان میں جموں و کشمیر وہ واحد علاقہ ہے، جہاں اُردو زبان تمام تر رقابتوں کے باوجود نسبتاً قابلِ ذکر حد تک اپنی اساس کو قائم رکھنے میں سرفہرست ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس خطے میں اُردو شاذ ہی کسی کی مادری زبان ہے لیکن اس کی عوامی اہمیت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے یہ یہاں کی سرکاری زبان کے مسند پر فائض ہے۔ گزشتہ سوا سو صدی میں جموں و کشمیر میں اُردو شاعری نے جو موڑ طے کیے ہیں اُنہیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُردو شاعری کا ایک باضابطہ دبستان یہاں تشکیل پذیر ہوا ہے۔ آلِ احمد سرور نے ایک زمانے میں اہلیانِ جموں و کشمیر کی اُردو دوستی پر شاعرانہ انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا:

دلّی کے گلی کوچوں میں جب چلی لُو
کشمیر کی وادی میں چلی آئی اُردو

سرور کا یہ دعویٰ، دعوائے محض نہیں ہے بلکہ اس کی تائید جموں و کشمیر کے شعرائے کرام نے جستہ جستہ اپنے شاعرانہ وجود کو منوا کر کی ہے۔ میر غلام رسول نازکی نے اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر کہا ہے:

کشمیر کا رہنے والا ہوں، اُردوئے معلی لکھتا ہوں
اس دیس میں مجھ جیسا کوئی سخن ور ہو نہ سکا

جموں و کشمیر میں اُردو شاعری کا جو قافلہ سوا سو سال پہلے نکل چکا تھا وہ کئی اہم پڑاؤ طے کرنے کے بعد آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں شعر و سخن کے نت نئے برگ و بار لا رہا ہے۔ فی زمانہ اس خطے میں جو شعرا اپنی فنی ہنرمندی اور فکری بصیرتوں کے چراغ جلا کر یہاں کے ادبی منظر نامے کو روشن کر رہے ہیں اُن میں رفیق راز، شبیب رضوی، شفق سوپوری، نذیر آزاد، پرتپال سنگھ بیتاب، ہمدم کاشمیری، احمد شناس، اشرف عادل کے ساتھ ساتھ بلراج بخشی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

بلراج بخشی نہ صرف جموں و کشمیر کے ایک معروف اور مستند شاعر کی حیثیت سے اُردو دنیا میں اپنی شناخت رکھتے ہیں بلکہ وہ اُردو زبان و ادب کے سماجی، تاریخی، لسانی اور ثقافتی پہلوؤں پر ارتکاز کرتے ہوئے کئی اہم قاموسی نوعیت کے کام سرانجام دے چکے ہیں، جن میں 'آسانیات: اول' اور 'آسانیات: دوم' مناسب اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ کتاب اُردو زبان کے محاورات اور ضرب الامثال کی تعریف و توضیح پر مشتمل ہے۔ جس کی بدولت بلراج بخشی کی قدر و منزلت میں علمی و ادبی حلقوں میں ایک خوشگوار اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

بلراج بخشی کا شعری مجموعہ 'مٹی کے موسم' ۲۰۲۱ء میں منصۂ شہود پر آکر ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اُن کی اُردو غزلوں میں جہاں ایک طرف کلاسیکی رچاؤ کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر معانی اور مفاہیم کے کناروں کو چھونے کی کوشش کرتی ہیں وہیں دوسری جانب اظہار و بیان کا بانکپن اپنی انفرادیت کا تماشا دکھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس باب میں اُن کے احساسِ عشق کی گرمیوں کی حدت کو قاری محسوس کیے بغیر رہ نہیں سکتا ہے:

اس لیے جلتا بدن لے کے چلا آتا ہوں
تری پلکوں کے تلے چھاؤں گھنی رہتی ہے

انتظار اُس کا، خیال اُس کا، تمنا اُس کی
جو خیالوں میں کہیں گلبدنی رہتی ہے

نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانے لگتا ہوں
خیال اُن کا گزرتا ہے جب صبا کی طرح

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بسا ہوا ہوں میں پھولوں میں خوشبوؤں کی طرح
ہوا چلی تو بکھر جاؤں گا، سنبھال مجھے

ڈھلی زمین میں پھل پھول جاؤں گا اک دن
تُو اِس یقین پہ نہ گملے سے اب نکال مجھے

اِن اشعار کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ بلراج بخشی کا جذبۂ عشق سادہ بھی ہے اور طرح دار بھی۔ جہاں وہ معشوق کی بے مروتی سے بے گانہ نہیں ہوتے وہیں دوسری طرف دستورِ عشق کی ستم ظریفیوں کو بھی گوارا کرنے میں تامل سے کام لیتے ہیں۔ وہ معشوق کی خاموش طبیعت سے نڈھال ہو کر ہر غم کو برداشت کر لیتے ہیں اور یوں وفا کی راہوں میں چل کر اپنے سچے جذبات کو غزل کی زبان میں اظہار کی دہلیز پر آ کر چھوڑ دیتے ہیں۔

بلراج بخشی حساس ہیں۔ انہوں نے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل سے اپنی تخلیقی صلاحیت کو جلا بخش کے انہیں بڑے سلیقے سے شعر کا حصہ بنایا۔ یوں اِن کی شاعری میں غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کا بھی پہلو نظر آتا ہے۔

پروفیسر کوثر مظہری نے اِن کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے: ''بلراج بخشی کی شاعری زندگی کی بے ثباتی، ستم ظریفی اور انسان کی بے بسی کے ساتھ ساتھ کسی اُفق سے طلوع ہوتی ہوئی آس کی شعاؤں کی بھی عکاس ہے۔ انھوں نے دنیا کو ایک تجربہ گاہ تصور کرتے ہوئے آس پاس کی اُتھل پتھل کو اپنے فکری ارتعاشات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی معاشرے کے تشدد آمیز رویّوں کو، محبت کی تقسیم کو، ٹوٹتی بکھرتی تہذیب کو اور منصبِ حیات سے متصادم آڑی ترچھی لکیروں کو بلراج بخشی نے اپنی تخلیقی ہنرمندی سے آرٹ کے پیکر میں ڈھالا ہے۔'' (بلراج بخشی: شاعرِ انفراد و امتیاز، مشمولہ فلیپ، مٹی کے موسم، اوشین پبلشنگ ہاؤس، ادھمپور، ۲۰۲۱ء)

اِدھر تقسیمِ ملک کے بعد کی صورتِ حال اور اس کے دیرپا اثرات نے دوسرے تخلیق کاروں کی طرح بلراج بخشی کو شدت سے متاثر کیا ہے۔ یہاں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ خود فرقہ وارانہ فسادات کے سمندر سے اُٹھنے والی لہروں سے بے حال ہوئے یا نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اُن کے دور کا ایک عام انسان اِس کربناک صورتِ حال سے کس طرح جوجھ رہا ہے۔ انسان کی انسانیت کس طرح سیاسی پروپیگنڈے کی بنیاد پر حیوانیت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اِس انسان کو کس طرح اپنے ہی جیسے انسانوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ بلراج بخشی نے اس دردو کرب کو اپنے اشعار میں یوں پیش کیا ہے:

ہم نے مِل جُل کے جلایا ہے جو گھر، کس کا تھا
اپنی تلوار ہے، گلا اپنا ہے، ڈر کس کا تھا

ستم نئے سے نئے ہم پہ ڈھائے جاتے ہیں
کہ رونا چاہتے ہیں جب ہنسائے جاتے ہیں

اب کے جو کاٹنی ہے فصل لہو کی بلراج
یہ وراثت مرے اجداد ہیں بونے والے

میں تو بلراج کہ مقتول بھی ہوں، قاتل بھی قتل میں
میرے مگر دستِ ہنر کس کا تھا

اِک نئے شہر کا نقشہ نہ بنا ڈالا ہو
پھر اُجڑتے ہوئے گھربار نظر آتے ہیں

یہ اور اس طرح کے درجنوں اشعار بلراج بخشی کے زیرِ نظر مجموعۂ کلام میں جستہ جستہ نظر آتے ہیں، جن میں موصوف نے انسانی رشتوں کی بے حرمتی اور ناقدری پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ صارفی تہذیب کے عروج، انسانی قدروں کی پامالی، غریب انسان کے مسائل کی سنگینی اور سختی نے شاعر کے تخلیقی وجدان کو جس انداز سے انگیز کیا ہے اُس سے شاعر کی حساسیت کا بھرپور تعارف ہوتا ہے:

قدم قدم پہ سہارے کا ہوگیا محتاج
اگر نہ تھامتا کوئی، تو میں سنبھل جاتا

اس خارجی کشمکش کے ساتھ موصوف نے داخلی محسوسات و تجربات کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ یہ داخلی دنیا

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

صرف خارجی دنیا کے معاشرتی عوامل وعناصر کا سیدھا سادا ردِ عمل نہیں ہے بلکہ یہ شاعر کے تخلیقی وجدان کی بھٹی میں تپ کر کندن بن کر سامنے آتی ہے۔ بلراج بخشی نے اس طرح کی صورتِ حال کو عمدہ انداز میں شعری جامہ پہنایا ہے:

اگر کبھی کسی صورت میں جی بہل جاتا
رُکا پڑا کوئی آنسوں ہوں میں، نکل جاتا

درد میرے ہیں تو آرام سے ہنسنے دیتے
تم اگر مجھ کو میرے حال پر رہنے دیتے

میرے حالات از خود بیان کرتے ہیں مجھ کو
مجھے کچھ اپنی زبان سے نہیں کہنے دیتے

ایک حالت جو تذبذب کی بنی رہتی ہے
ایک سائے سے بھی ہر وقت ٹھنی رہتی ہے

بلراج بخشی نے جہاں قدرے لمبی بحروں میں غزلوں کا ایک وافر سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہیں چھوٹی بحروں میں بھی اپنی فنی ہنرمندی کا ثبوت پیش کیا ہے:

گھر آنگن سب تیرا ہو
بس اک تو ہی میرا ہو
پھر آوارہ گیت سنیں
پھر جوگی کا پھیرا ہو
اک وادی ہو نیندوں کی
اور خوابوں کا ڈیرا ہو
دھوپ کی بارش ہو لیکن
سایہ گھنا اندھیرا ہو
حیرت، خوف، خوشی بلراج
ناگن، بین، سپیرا ہو

بلراج بخشی نے نظموں کے ذریعے بھی اپنے مافی الضمیر کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔اُن کی نظمیں انسان کے داخلی دردو کرب اور گھٹن کا برملا اظہار ہیں، نیز سماجی، مذہبی، سیاسی اور تہذیبی خطوط پر انسان اور انسایت کی تقسیم کو انہوں نے جان سوز قرار دیا ہے۔ان کی نظمیں اکثر مقامات پر فکر وخیال کے وسیع تجربات کی غمازی کرتی ہیں۔اُن کی نظم 'جبر' ملاحظہ کیجئے:

میں اپنے حصے کی لڑائی لڑ چکا ہوں
مگر میں ایسی لڑائیاں آج لڑ رہا ہوں
کہ جو مسلط ہوئی ہیں مجھ پر
کہ جو نہیں تھیں مری
مگر مجھ پر فرض کر دیں
معاشرے نے
معاشرہ جو کہ آچکا تھا وجود میں
میرے پیدا ہونے سے قبل
جس سے فرار ممکن نہیں ہے میرا

(صفحہ ۳۳)

ایک اور نظم 'ابدی آزادی کا لمحہ' میں شاعر نے انسان کی انسانیت سوز حرکات سے ماحول کے مسموم فضا کا نوحہ بڑی دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بلراج بخشی کی نظموں میں وہ فکری اعماق جستہ جستہ جلوہ گر ہوتے ہیں جو کسی بھی شاعری کو زندہ و جاوید رکھنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

بلراج بخشی کا اسلوبِ بیان سادہ ہوتے ہوئے بھی دلکش اور تہہ دار معلوم ہوتا ہے۔اِن کے کلام کی سادگی سہلِ ممتنع کی حدوں کو چھو کر گزر رہی ہے۔کلاسیکی شعرا کی لفظیات کو نئے اور عصری حسیت سے معمور کرنے کا ہنر بلراج کو قدرت نے خاص طور پر بخشا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کو بین المتونی زاویہ سے پرکھنے اور جانچنے کے امکانات ان کے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ ہیں جو انہیں معتبر بھی بناتے ہیں اور منفرد بھی۔ مختصراً یہ کہ بلراج بخشی اپنی شاعری کی بنیاد پر اُردو کے ثقافتی فروغ میں ایک اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بلراج بخشی کی رنگ برنگی کہانیاں

■ڈاکٹر ریاض توحیدی، کشمیر

بلراج بخشی نثر ونظم میں فن کاری دکھانے کے فنی جوہر (Artistic essence) کا استادانہ ملکہ رکھتے تھے۔ ان کی شاعری اور افسانہ نگاری کا فنی معیار دیکھ کر مجھے سہیل کاکوروی کا شعر یاد آتا ہے:

سخن ہے معتبر تیرا سہیل اس نے کہا مجھ سے
قلم سے تیرے اکثر شعر استادانہ آتا ہے

بلراج بخشی (1949-2024 جموں وکشمیر) کی شاعری ہو یا افسانہ نگاری، دونوں جگہوں پر اُن کا شگفتہ اسلوب اور دلکش اظہارِ خیال نظر آتا ہے۔ اردو زبان کی اصطلاح سازی پر ان کی گہری نظر تھی، جو کہ ان کی کتاب 'آسانیات... مجموعہ افعال واسما' کی دو جلدوں سے واضح ہوجاتا ہے۔ ایک ادبی رسالہ 'زبان وبیان' بھی جاری کیا تھا۔ رسالے کی نشرواشاعت کے اخراجات خود اپنی جیب سے پورے کرتے رہے۔ ان کے حوصلہ افزا ارادوں اور اردو کی محبت کے تعلق سے ان کا ہی ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

عجیب معجزہ کاری تھی اس کی باتوں میں
کہ وہ یقین کے جزیرے ابھار سکتا تھا

'مٹی کے رنگ' کے نام سے ان کا ایک شعری مجموعہ اور فکشن کے تعلق سے مجموعہ 'ایک بوند زندگی' 2014ء میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ یہ بارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ 'فیصلہ'، 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ'، 'زچ'، 'مشترکہ اعلامیہ'، 'مکتی'، 'کیا نہیں ہوسکتا'، 'مُکلاوہ'، 'گرفتہ'، 'کھانسی ایک شام کی'، 'ہارا ہوا محاذ'، 'چور'، 'ایک بوند زندگی'۔ مجموعے میں پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر مولا بخش اور ڈاکٹر مشتاق صدف کے مضامین شامل ہیں اور اسے بہار اردو اکادمی، پٹنہ کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

افسانہ اگر زندگی کے کسی حقیقی پہلو کی عکاسی کرتا ہو تو اس حقیقت کو فن کاری کے توسط سے اس طرح فسانہ بنانا پڑتا ہے کہ حقیقت اور فن کاری کے درمیان ایک ہلکا سا پردہ حائل رہے اور جونہی قاری پردہ ہٹائے تو اس کے سامنے حقیقت کھل کر سامنے آئے۔ فن کاری کا یہ پردہ کبھی آسان اسلوب اور کبھی علامتی اسلوب کی صورت میں بیانیہ کا حصہ بن جاتا ہے، لیکن دونوں صورتوں میں بنیادی اہمیت فن کاری کو حاصل ہے۔ بلراج بخشی کا افسانہ 'فیصلہ' آسان اسلوب کے ساتھ ساتھ علامتی رنگ میں حقیقت اور فن کاری کے پردے میں ایک ایسی کہانی سامنے لاتا ہے جو بظاہر ایک جنگلی مرغے کو پکڑنے کے واقعہ کے اردگرد گھومتی رہتی ہے لیکن عنوان فیصلہ، جج مظفر علی اور خصوصاً جنگلی مرغا سارے ماجرے میں علامت اساس کردار بن کر سامنے آتے ہیں۔ جس میں آج کی عدلیہ فیصلوں کو طنز ومزاح کے دائرے میں نشانہ بنایا گیا ہے۔ اگر اس پہلو کو افسانے سے نکالا جائے تو ساری کہانی ایک ناٹک کے سوا کچھ نہیں لگے گی۔ اس لئے افسانے میں فن کاری کے جلوے پر دھیان دینے سے ہی قانونی فیصلوں کی تلخ سچائی سامنے آئے گی جو کہ افسانے کو ایک عمدہ فن پارہ بنا رہا ہے۔ افسانے کا محل وقوع جموں وکشمیر کا ایک خوبصورت علاقہ بھدرواہ ہے، جس کو چھوٹا کشمیر بھی کہا جاتا ہے۔ برف باری کے دوران خطے کے چند دیگر جگہوں کی طرح یہاں بھی لوگوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس اظہار افسانہ نیوز چینل کی رپورٹ میں پیش کررہا ہے۔ اسی سردی کے موسم میں پوری کہانی پیش ہوئی ہے۔ افسانے میں مقامی کلچر کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں جیسے جج مظفر علی رانا کا 'سموار' سے کپ میں شیر چائے انڈیلنا یا افسانہ نگار کا کشمیری چائے یا نون چائے کا ذکر کرنا، جس کا چلن ان علاقوں میں بھی ہے۔ افسانے کی منظر نگاری میں برف کے نظارے کی منظر کشی بھی کی گئی ہے۔ جب جج صاحب لحاف کی گرم حرارت کو بے دلی سے چھوڑ کر عدالت جانے کے لئے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہیں تو:

" حدِ نظر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ برف کی تہ اس قدر دبیز تھی کہ باہر زمین کے خدوخال میں کسی قسم کا شناختی نشان

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ حد نظر تک برفستان بن گیا تھا۔''
(ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۳۱)

اب منطقی طور پر افسانے میں پیش ہوئے ایک موضوع کو اجاگر کیا گیا ہے، وہ ہے جج صاحب کے گوشت کھانے کی تڑپ۔ کیونکہ پچھلے چند روز سے بارف باری کی وجہ سے راستے بند پڑے تھے۔ بازار میں اشیاء خوردونوش کی قلت پیدا ہوگئی تھی۔ اردلی جب ناشتے کا ذکر کرتے ہوئے صرف آلو پراٹھے کی جانکاری دیتا ہے تو جج کا موڈ خراب ہوجاتا ہے اور گوشت کھانے کی تڑپ بڑھ جاتی ہے۔ اس کے بعد افسانے کی بنیادی کہانی شروع ہوجاتی ہے، جو جنگلی مرغے کی علامتی کردار نگاری پر گھومتی رہتی ہے۔

جج جب عدالت کی طرف نکلتا ہے تو راستے میں ایک واقعہ پیش آتا ہے۔ کئی لوگ ایک جنگلی مرغے (لاکھا) کو پکڑنے کی کوشش کررہے تھے۔ بظاہر یہ ایک عام سا واقعہ ہے کیونکہ برف کے دنوں میں جنگل کے نزدیک علاقوں میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ جنگلی مرغے بستیوں کی جانب چلے آتے ہیں اور لوگ انہیں پکڑ کر ضیافت بناتے ہیں لیکن افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ جنگلی مرغے کے ایک عام سے واقعے کو افسانے کا روپ دے دیا ہے۔ جس میں جج، عدالت، سرکاری ملازمین اور عوام تک کو کردار بنا کر موضوع میں جدت پیدا کی ہے۔ جج نے جب مرغے کو دیکھا ہے تو اس کے منہ میں پانی آجاتا ہے:

''اچانک اسے فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز مہک سی آئی اور جنگلی مرغ کی بڑی سی ٹانگ کو جبڑوں میں محسوس کرکے اس کی زبان پیشگی لذت سے سرشار ہونے لگی۔''
(ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۳۴)

جج صاحب میں مرغا کھانے کی شدید تڑپ پیدا ہوگئی اور انھوں نے اردلی سے جو کہا جو ہماری عدالتوں کے فیصلوں کی بھی عکاسی کرتا ہے:

''سلیمان......اسے کوئی نہ کوئی تو پکڑ ہی لے گا...... جتنے روپے مانگتا ہے دے کر لے آنا...... جاؤ......''
(ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۳۴)

افسانے میں جج صاحب کے بارے میں جس طرح بتایا گیا ہے اور پھر اس کو مرغے کی کہانی سے ملانے سے جو منظرنامہ بنتا ہے وہ فنی طور پر کہانی کو علامتی روپ دے رہا ہے کیونکہ اگر صرف جنگلی مرغے کے پکڑنے کا واقعہ ہی پیش کرنا ہوتا تو افسانے میں دوسری باتیں پیش نہ کی جاتیں۔ اس لئے افسانہ نگار نے بیانیہ میں مرغے کے واقعے کو ایک سماجی ایشو بنا کر پیش کیا ہے۔ جیسے جج صاحب کا یہ سوچنا:

''آپ نے کسی بھی طرح کسی بھی ادارے میں اور کسی بھی سطح پر ایک بار متعین ہونا ہے اور پھر آپ کو لوگوں پر اختیار مل جاتا ہے اور لوگ آپ کو کئی طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمال کا سسٹم ہے، اس نے سوچا اور چونک پڑا۔''
(ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۳۴)

مرغا لوگوں کے نرغے سے بچ کر عدالت کے کمرے میں پہنچ جاتا ہے۔ عدالت کی کھڑکیوں کو بند کردیا جاتا ہے اور مرغے کو یہاں کا ماحول جنگل کے ماحول سے بھی خوفناک نظر آتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ جنگلی جانوروں کے برعکس انسان سے یہ اس کی پہلی مڈبھیڑ ہے اور وہ اس نئے حریف کی جنگجویانہ صلاحیتوں سے قطعی نابلد ہے۔ مرغے کو دبوچ لیا جاتا ہے اور اس کے گلے پر چھری پھیرنے سے پہلے جج رانا ٹھہرنے کا آڈر دیتا ہے اور مرغے کو آزاد کیا جاتا ہے۔ اس طرح افسانہ دلچسپ انداز سے کہانی کو انجام تک پہنچاتا ہے۔ جس کی وجہ سے افسانہ اپنا عمدہ تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہتا ہے۔

افسانہ 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' کا بنیادی موضوع حق آزادی اظہار رائے (Right to freedom of speech and expression) ہے۔ آئین ہند کے بنیادی حقوق (دفعہ: 19.20) میں ایک عام شہری کا قانونی دائرے کے اندر اپنے مطالبات اور اظہار رائے کا حق بھی شامل ہے۔ جس میں استحصال اور رشوت خوری (Corruption) کے خلاف آواز بلند کرنا بھی ہے۔ افسانے میں ایک ایسا کردار خلق کیا گیا ہے جس کو ایک غیر سیاسی عوامی تحریک کا ساتھ دینے کی پاداش میں سرکاری سطح پر مختلف حیلے بہانوں سے پریشان کیا جاتا ہے۔ وہ تحریک

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

مہنگائی، رشوت خوری اور دہشت گردی کے خلاف ایک عوامی احتجاج تھا جو کہ جمہوری حقوق سلب کرنے کے خلاف تھا اور کسی بھی شہری کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان چیزوں کے خلاف آواز بلند کرے۔ لیکن کمشنر فائل کا جائزہ لیتے ہوئے اسے اسی بنیاد پر پوچھ تاچھ کرتا ہے کہ تم حکومت مخالف جلوس میں پیش پیش تھے۔ وہ یہ سن کر کہتا ہے:

’’لیکن ......‘‘ وہ سوکھتے ہونٹوں کو لعاب سے تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا: ’’وہ تو...... وہ تو غیر سیاسی تحریک تھی۔‘‘ (ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۳۹)

یہ سنتے ہی کمشنر میز پر ہاتھ مار کر دہاڑتا ہے:

’’اور اسی لئے خطرناک تھی۔‘‘ مرکزی کردار ایک ٹریولنگ ایجنٹ ہوتا ہے اور اسے سرکاری شناختی کارڈ بنانا ہوتا ہے تاکہ ہوٹلوں میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اسی کے لئے فائل کمشنر کے آفس میں اٹکی رہتی ہے۔ کمشنر اسے کئی اور سوالات پوچھتا رہتا ہے اور ساتھ ہی کچھ کاغذات کی عدم دستیابی کا حوالہ دے کر اسے شناختی کارڈ دینے سے انکار کرتا ہے۔ وہ جب یہ صورتحال دیکھتا ہے تو بالآخر مایوس ہو کر کہتا ہے:

’’تب پھر...... یقیناً آپ میرا ایک کام تو کر ہی سکیں گے جناب......‘‘ اس نے کہا۔

’’مجھے خوشی ہوگی...... تم ایک گمراہ...... لیکن...... باشعور شہری ہو ...... بات سمجھتے ہو...... کہو ......‘‘

’’کیا جناب والا مجھے ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کی عنایت کر سکتے ہیں؟‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ (ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۴۵)

یہ سن کر کمشنر حیران ہو جاتا ہے اور عام شہری کہتا ہے تاکہ اس کے بچوں کو سرکاری کاغذات بنانے میں کوئی پریشانی نہ ہو جائے:

’’ڈیتھ سرٹیفکیٹ مل جائے تو...... بعد از مرگ تو میری آئیڈنٹی بہ آسانی ثابت ہو جائے گی...... کہ...... میں کبھی...... تھا...... اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ...... ایک سرکاری دستاویز...... ہو سکتا ہے ان کے کسی کام آجائے......‘‘ (ایک بوند زندگی۔ صفحہ ۴۵)

اس طرح افسانہ ایک زوردار طنز کے ساتھ یہ پیغام دیتا ہے کہ کرپشن اور تاناشاہی کے دور میں جمہوریت اور آئین کا کس طرح مذاق اڑایا جاتا ہے اور ایک ایسا انسان جو اس کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اس کو اتنا ستایا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے بجائے موت کو ترجیح دیتا ہے۔ افسانے کا پورا پلاٹ مکالماتی اسلوب پر استوار ہوا ہے اور افسانہ دو کرداروں کمشنر اور ایک ٹریولنگ سیلز مین کے مکالموں سے سارا ماجرا سامنے لاتا ہے جو کہ بڑی ہنرمندی سے پوری افسوسناک صورتحال کو سامنے لاتا ہے۔

کسی بھی افسانے کے لئے موضوع کے مطابق مناسب جانکاری ہونی چاہیے تب جا کے وہ افسانہ اپنا فنی و موضوعاتی تاثر برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بلراج بخشی کا ایک افسانہ بعنوان ’’زچ‘‘ معالجاتی موضوع پر تخلیق ہوا ہے اور افسانہ نگار اس کی مناسب معلومات اور جزئیات کو برتنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ جیسے کچھ میڈیکل اصطلاحات کا استعمال۔ Male infertility, Estrogens, Sperms count, Vitro fertility clinic, incubator وغیرہ۔

افسانے کا بنیادی موضوع مصنوعی تخم ریزی (Artificial insemination) ہے تاہم افسانہ نگار نے اس موضوع کو انسانی جذبات واحساسات، محبت وشفقت اور فطرت کے قوانین کے ساتھ جوڑ کر عمدہ کہانی بُنی ہے۔ اصل میں ایک جوڑا بچے سے محروم ہوتا ہے۔ شوہر مصنوعی تخم ریزی کے ذریعے بچہ چاہتا ہے اور ڈاکٹر سے مشورہ کرتا ہے لیکن بیوی اس قسم کے مصنوعی طریقہ کار کے لئے تیار نہیں ہوتی ہے۔ اس دوران میاں بیوی کے درمیان فلسفیانہ نوعیت کی بحث بھی ہو جاتی ہے اور قدیم آرائی سماج اور متھ (Myth) کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ آخر کار شوہر (ساحل) بیوی کو منوا لیتا ہے لیکن افسانے میں کئی ایسی جذباتی اور فطری باتیں زیر متن رکھی گئی ہیں کہ انسان کی فطری خوشی میں جو مزہ ہوتا ہے وہ مصنوعی پن میں نہیں ہے۔ کہیں کہیں پر افسانے کا پلاٹ فلسفیانہ باتوں سے بوجھل ہو گیا ہے جو کہ قاری پر اکتاہٹ طاری کر دیتا ہے۔ اس کے بغیر بھی کہانی اچھے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

ڈھنگ سے آگے بڑھائی جاسکتی تھی کیونکہ موضوع کے مطابق کہانی خود اپنا جواز پیدا کررہی تھی۔

انسان جب شعور کی آنکھ سے دیکھتا ہے تو اس کا ضمیر غیر فطری رسم ورواج اور سماجی پابندیوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوجاتا۔ افسانہ ''ایک بوند زندگی'' ایک ایسے ہی انقلابی انسان کی کہانی ہے جس کا ضمیر سماجی پابندیوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے اور وہ باغی بن کر اس سماج سے فرار ہوجاتا ہے۔ کافی عرصے تک وہ فرار ہی رہتا ہے لیکن ایک دن پکڑا جاتا ہے اور بستی میں پہنچایا جاتا ہے۔ وہاں پر لوگ جمع ہوجاتے ہیں اور اس کی بغاوت پر گفتگو شروع ہوجاتی ہے۔ اسے کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی انسان اس دیوار کو پھاند کر بھاگ نہیں سکتا یعنی رسم و رواج وغیرہ کو چھوڑنے کی غلطی نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد افسانہ اچانک ڈرامائی موڑ لیتا ہے اور ایک نوجوان خنجر سے اس پر وار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تجھے عذاب سے نجات دلادی کیونکہ تجھ پر سخت مظالم ڈھائے جاتے۔ یہ کہہ کر وہ نوجوان تلوار ہاتھ میں اٹھا کر دیوار پھاند کر بھاگ جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر زخمی آدمی کے ہونٹوں پر طمانیت بھری خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوجاتی ہے اور وہ خوش ہوجاتا ہے کہ اس نے جو بیج بویا تھا وہ اب پھل پھول رہا ہے اور یہی مرتے مرتے اسے ایک بوند زندگی معلوم ہوتی ہے:

''اب میں ... زخمی کے خشک ہونٹوں پر طمانیت بھری ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ زیر لب بڑبڑایا ... اب میں سکون سے مر سکوں گا۔'' (ایک بوند زندگی صفحہ ۱۵۸)

افسانہ آسان اسلوب میں ہونے کے باوجود نصف سے زیادہ علامتی لبادہ اوڑھے ہوئے ہے کیونکہ نصف کہانی تک صرف کردار کے جذبات اور نفسیاتی الجھن اور فرار کی ابہامی فضابندی نظر آتی ہے اور پھر اس کے بعد اصلی قصہ کھلنا شروع ہوجاتا ہے لیکن وہ بھی ابہامی انداز سے۔ افسانہ اپنا فنی تاثر قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

کتاب میں اور بھی عمدہ افسانے موجود ہیں۔ بلراج بخشی تخلیقی ذہن فنکار تھے، جس کا ثبوت ان کی شاعری اور افسانے ہیں۔ زبان وبیان پر ان کی ماہرانہ دسترس تھی۔ افسانوں میں بیانیہ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ پلاٹ سازی کا عمدہ شعور رکھتے تھے اور کردار نگاری کو مناسب انداز سے نبھاتے تھے۔ کبھی کبھار وہ دو تین کرداروں کے ذریعے ہی پوری کہانی پیش کرتے تھے اور اس میں کسی بھی قسم کا فنی سقم نہیں رہتا تھا۔ ان کے افسانوں میں جزئیات نگاری کا عمدہ استعمال نظر آتا ہے جس کی وجہ سے پلاٹ چست بن گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں وجودی مسائل بھی نظر آتے ہیں اور سیاسی وسماجی موضوعات بھی اور ہر جگہ کہانی کو انجام تک پہنچانے میں وحدت تاثر کی فنی خوبی نظر آتی ہے جو کہ ایک کامیاب افسانہ نگار کی بڑی فنی خوبی ہوتی ہے۔ نہیں تو بیشتر لوگ لکھنے کے دوران چار پانچ صفحات کی کہانی کو دس بیس صفحات تک پھیلا دیتے ہیں جس کی وجہ سے بیانیہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور وحدت تاثر بھی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

☆☆☆

Wadipora, Handwara, Kupwara
Kashmir-193221
Mobile No.9906834877

وہ ایک ابر کا ٹکڑا میں ایک بوند آنسو
کہاں کہاں کے لئے وہ ہے میں کہاں کے لیے

جسم و جاں، فکر و انا، کچھ تو بچا ہے میرا
حادثہ کوئی پتہ پوچھ رہا ہے میرا

اس طرح ہو گئے تقسیم کہ سوچا بھی نہیں
کس کی شاخیں ہیں، ثمر کس کے، شجر کس کا تھا

بلراج بخشی

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بلراج بخشی کی شاعری

■ رویندر جوگلیکر، بھوپال

کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیق میں فکر و مشاہدے کی جڑیں زماں و مکاں کی وسیع گہرائیوں میں پھیلی ہوتی ہیں۔ان جڑوں میں وراثت کا کھاد پانی ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کیے گئے مشاہدے اور اس سے حاصل آگہی کے تعلق سے اندرون میں موازنہ اور تجزیہ بھی متوازی طور پر چلتا رہتا ہے۔بلراج بخشی کے شعری مجموعہ 'مٹی کے موسم' میں شامل غزلیں اور نظمیں اس بات کی طرف صاف اِشارہ کرتی ہیں کہ وہ باہری دنیا کے ساتھ اپنے تعلق سے پیدا ہوئے اثرات اور اپنی اندر کی دنیا، فکرِ زندگی اور فلسفے کے بیچ کسی قسم کا رابطہ محسوس کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں اور اس صورت حال سے مطمئن نہیں ہیں بلکہ باہر کی دنیا سے تعلق رکھنے سے حاصل شناخت کو اپنی اندرون کی فکرِ زندگی کے ساتھ بحث کرنے کی مشکل چنوتی سے جوجھتے بھی ہیں۔

لیکن پیشتر اس کے تصنیف کا تجزیاتی مطالعہ پیش کروں، اس مطالعے میں اپنائی گئی باتوں کے نسبت عرض کرتا چلوں۔ایک تو یہ کہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے میرا دھیان فن پارے کی نسبت سے ذہن کو ترتیب دینے والے عناصر خواب، یاس، مایوسی، شکست وریخت، امید، تلخی وغیرہ اس قسم کے بہت سے مسئلوں کے سیاق میں مجھے شاعر کی شاعری کو دیکھنا درست معلوم ہوتا ہے۔دوسرا یہ کہ شاعری کے مطالعہ سے ہی وہ تجزیاتی نقطے کو بھی حاصل کرنا چاہئے جو بنیادی طور پر شعور کا جز ہوتا ہے۔اسی شعور کی مختلف جہتوں میں شاعر کی تخلیقی کاوش کارفرما رہتی ہیں، اور اس مجموعی طریقہ کار کو اختیار کرتے ہوئے کلام کو ہمہ جہت نقطۂ نگاہ سے پرکھنے کے لیے مجھے متن کی مختلف سطح میں بھی داخل ہونے کی ضرورت ہے جہاں شاعر اپنے ماحول کے تمام اثرات کو قبول کرتا ہے اور جہاں بیدار ہوتے ہوئے ذہن کی اساس کے نقوش پائے جاتے ہیں، یہ مطالعے کی چیزیں ہیں جو نفسی اعمال کے گھیروں میں سے ہوتی ہوئی بلراج کی شاعری کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

بلراج نے یہ محسوس کیا کہ معقول الفاج موزوں کرنے، پیکر تراشی اور بیان میں سادگی کی رِدا لپیٹ کر شاعری میں ایک نوع کی کشش تو پیدا کی جا سکتی ہے لیکن شاعری میں اپنی بات کہنے سے سمجھوتا بھی کرنا پڑ سکتا ہے گویا مٹی جوذات کا تشبیہ ہے اس کے مختلف رنگ یعنی احساسات، وجودیت، شعور کی داخلی کارفرمائی کو اپنی پوری قوت سے ظاہر کرنے کے لیے لہجے اور بیان میں سلاست لازمی طور پر بنی رہے۔بلراج کی شاعری میں ان کے اندر کے شاعر نے سماج، فلسفے، زبان، رشتے، احساسات جس کسی کا بھی مشاہدہ کیا تو نتائج کو قبول کرنے سے قبل آگہی سے بنی کسوٹی پر کس نے پر ہر وقت اسرار کیا ہے۔

سڑک کے بیچ چلنا بھی ہے مجھ کو
مگر بچ کر نکلنا بھی ہے مجھ کو

حوالے زیست کے تعمیر اپنی مت کرنا
یہ بت تراش ہے پہلے تو بت شکن آخر

رقیب ہو گیا میرا ہی پیرہن آخر
نہ آشکار ہوا مجھ پہ وہ بدن آخر

مرا خدا پر بھروسہ ہی نہیں ہے بلراج
وہی دیتا ہے دغا جس پر یقیں ہوتا ہے

ان کی شاعری میں اندرون کی گرہ سمجھنے اور پھر اسے کھولنے کی بہت جدوجہد نظر آتی ہے یہ عمل اس لیے بھی لازمی تھا کیوں کہ وہ شخصیت میں انا پرست جہت کی شکل سے آگاہ ہوتے چلے جا رہے تھے جو ان کی شاعری کا اہم ارتقائی پہلو ہے۔اس نفسیاتی حصار کو بار بار توڑنے کا کام بلراج نے پوری تخلیقی قوتِ اظہار سے کیا۔تعقل پسند ذہن سے کام لیتے ہوئے پہلے سے طے شدہ پیمانوں کو مسلسل رد کرنے کی بلراج کی یہ کوشش ان گرہوں کو کھولنے کا ایک اہم وسیلہ بن جاتی ہے۔نظم 'نروان' کا یہ بندان کی

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

شاعری کی فضا میں چھائی ایک مرکزی یا کلیدی فکر کا Manifesto کہا جاسکتا ہے۔

میں اس نسل کا آخری آدمی ہوں
مرے سامنے دونوں تابوت ہیں
ماضی وحال کے
ان پہ لکھا ہوا سارا افسانہ ارتقاء
فلسفہ
ساری تہذیب کا مرثیہ،
مضمحل آرزوؤں کی تضحیک بھی،
اس زمیں کے تقدس کی تذلیل بھی

اور پھر اسی نظم کے آخری حصے میں اُس کشمکش کی بازگشت ہے جو ان دو دنیاؤں کے درمیان تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔

وقت کے تیسرے جسم کی زندگی مجھ میں مضمر ہے،
میں نسل آئندہ کی اک شروعات ہوں،

اس مجموعے میں موجود بلراج کی شاعری کو پڑھنے سے میرے ذہن میں اُبھرتی ہے وہ یہ ہے کہ شاعری کی فکر کے جو دھارے ہیں اس میں نہ کوئی فلسفیانہ رمزیت کا کوہرا ہے نہ بیان میں پیچیدگی، ایک ایسی Stream ہے جو بہت صاف ہے، شفافیت رکھتی ہے اور اس کی بناوٹ بہت گھنی ہے۔ حساس، شدتِ جذبات اور سنجیدہ شخصیت سے بنی ہوئی۔ ہم دردی ان کی شاعری کا وصف ذاتی ہے۔ اگر کوئی تلخ بیان نکل بھی گیا تو اس کی تلافی کے لیے وہ بے چین نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے چند شعر پیش ہیں۔

نظروں میں کچھ نہیں ہے نشانوں میں کچھ نہیں
سب تیر چل چکے ہیں کمانوں میں کچھ نہیں
نا کام خواہشوں کے ہیں قصے کہانیاں
بلراج درد وغم کے خزانوں میں کچھ نہیں

گردش افلاک یہ کیسی ڈگر آئی
دلوں کے درمیاں اک ارض فاصل سی نظر آئی
نہیں، یوں ہی وہ کوئی ٹوٹتا روشن ستارہ تھا
گھڑی بھر کو لگا جیسے کوئی امید بر آئی

ناکام خواہش، سب تیر، نظروں میں کچھ نہیں جیسے تلخ احساسات گھڑی بھر کو امید کے ٹوٹنے کا گمان پیدا کر جاتا ہے لیکن پھر ہوش آجاتا ہے کہ یہ تلخی ارض فاصل کے امکان کے سبب تھی۔

اس مجموعے میں جو شاعری موجود ہے اس کے احساس اور فکر کے تناسب سے Diction میں جو تبدیلی اور ترمیم کا پہلو ہے وہ اُس آگہی کو سمجھتے رہنے کا ثبوت ہے جس کا ذکر مدرجہ بالا شروعات کے پیراگراف میں کیا ہے۔ نظم 'نروان' سے 'جبر' ہوتے ہوئے 'قرض' پھر 'قوس' تک ان کی نظمیں شعور میں آگہی کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ایک شاعر میں اس بات کا ہونا ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایک فنکار اپنے احساسات کی زمین پر محنت سے کام کرتے ہوئے اپنی تخلیقی عمل میں داخلی اور خارجی عناصر سے غیر جانب داری کے ساتھ مکالمہ بھی کرے اور تجربہ کرنے سے پیچھے نہ ہٹے۔ بلراج اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ جمود شکنی، ترمیم اور تبدیلی شاعر کا عزمِ عزیز ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک اہم جز یہ بھی ہے کہ شاعری میں جو آگہی ہے وہ کسی ادبی نظریہ کی فلسفیانہ بنیاد پر کسی تنقیدی رویہ سے نہیں قبول کی گئی ہے، بلکہ یہ اپنے تجربات کی روشنی میں تخلیقی عمل سے گزرتے شاعر کی ذہنی نشو ونما کی نمائندگی ہے۔ زندگی میں احساس، تجربہ اور شعور کی سطح پر مختلف تجزیاتی قوتوں کا تصادم چلتا رہتا ہے اس لیے یہ فطری بات ہے کہ ادب بھی اس کی عکاسی کرے گا۔ اِس تصادم کے ساتھ جب ربط ضبط ہونے پر، منطق کو قبول ہونے والا احساس پنپتا ہے تب وہ تخلیق میں جگہ پاتا ہے۔

نظم 'تشنگی' اور 'فیصلہ' میں اُوپر کے اقتباس میں عرض پہلوؤں کی کارکردگی کو شاعرانہ بیان کے پس منظر میں بہت صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی شاعر اور اس کے مخاطب کے درمیان بدلتے ہوئے تعلقات کے ساتھ وقت اور تاریخ کے مابین بدلتے رشتے کی بھی عکاسی ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے بلراج کی شاعری خاص کر نظم زندگی کے طول وعرض سے قریبی رشتہ رکھتی ہے۔ ان نظموں کا شاعر بڑی خوبصورتی سے تصادم کا سبب بنے پہلوؤں کو پکڑتا ہے۔ اس مجموعے (مٹی کے موسم) کی تقریباً تمام نظموں میں نظم ایک بہت مضبوط حقیقت کی بنیاد پر اُٹھتی ہے اور پھر قوتِ تصور کے ساتھ نظم کی فضا بیان ہوتی چلتی ہے۔ اپنی شاعری میں بلراج ایک خانہ بدوش ہیں کیوں کہ بعض غزلوں اور نظموں کے بیشتر حصوں میں وہ ایک سفر ناتمام میں نظر آتے اور تجربہ کرتے ہوئے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

آگہی کے نشانات چھوڑتے چلتے ہیں۔ اس پس منظر میں ملاحظہ فرمائیں نظموں کے ان ٹکڑوں کو جہاں شاعر مختلف وجوہات کے سبب قرب سے دو چار ہے۔ اس طرح جہاں وہ اپنے عہد کی اُلجھنوں، تصادات اور اذیتوں کو اپنے اندر اُتار کر معنی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک نیوٹرل ہو کر انھیں as a whole دیکھنے کی کوشش بھی جاری رکھتا ہے۔ ان دونوں صورت حال میں ان کا نظریہ یاس آمیز نہیں بلکہ خود مختاری سے بھری اپنی ذات پر یقین رکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

میری ہم رقص کوئی دوسرا ساتھی چن لے
یہ نہیں ہے کہ مجھے تجھ سے محبت ہی نہیں
تو مری عمر کی کاوش کا صلہ ہے لیکن
ترے احساس الگ ہیں مرے افکار الگ
ترا انداز جدا ہے مری رفتار الگ
تجھے ماضی کی روایات سے نسبت ٹھہری
مجھے یک رنگی حالات سے نفرت ٹھہری

(نظم: فیصلہ)

روح بکھری ہے ابھی
چاندنی آگ اگلتی ہے ابھی،
منجمد ہو بھی گئی تہ در تہ درد کی برف،
عمر گزری ہے اسے جمنے میں،
وقت بیتے گا پگھلنے میں اسے،
ایک ساعت میں کسی روز
اچانک یوں ہی
تم چھوؤ گے تو گرا دو گے اسے؟
درد اک ریت کا میلہ تو نہیں

(نظم تشنگی)

بلراج کے ہاں آگہی کے احساس کو شعور میں مخصوص فکری آہنگ کے ساتھ مربوط کر کے بیان کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ اور جب یہ کاوشیں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتیں تو نظموں میں ناراضی، دباؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس میں دبا ہوا خوف اور مستقبل کی بے یقینی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ تنہائی کا احساس بھی اسی جذبہ کا فیضان ہے۔

سنا ہے تم مر گئے ہو
لیکن میں کس طرح
اپنے غم، (مسرت کا)
رسمی اظہار کر سکوں گا کہ میں تو
لفظوں کی آزمائش سے
آج بھی سرخرو نہیں ہوں۔

(صفحہ ۱۷۹: تعزیت نامہ)

زمین سے آسماں کی جانب لپکتے رہنا کہ
کبھی کبھی نشہ خودی میں بھٹکتے رہنا
کسی کے نقش قدم پر چلنے میں کیا رکھا ہے
تلاش میں اپنے راستے کی بھٹکتے رہنا

(صفحہ: ۱۲۲)

یہاں یہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ بلراج نظم کے شاعر ہیں یا غزل کے۔ بطور شاعر اپنے دور کی نسل میں جدید تر اور اہم نام ہیں۔ بہت سی باتیں پچھلے کئی برسوں میں اردو شاعر میں ایک ساتھ ہوئی ہیں ایک طرف مابعد جدیدیت کا طوفان برپا تھا جس میں کچھ بھی صاف صاف دیکھنا مشکل تھا تو دوسری طرف مختلف دائروں میں شناخت کی فکری آگہی کا مسئلہ بھی چل رہا تھا۔ کسی بھی جدید ادیب کے لیے نظریاتی دباؤ، مذہبی اقدار اور سیاسی افواہوں سے دامن بچانا آسان نہیں رہتا اور بعض دفع اس ماحول میں لکھا گیا ادب بھرم اور یک جہتی کا شکار ہو جاتا ہے۔ بلراج بخشی ادب میں اس خطرے کو بخوبی سمجھتے تھے جوان کی شاعری کو پڑھ کر سمجھ میں بھی آتا ہے۔ وہ بڑے ہی فطری طریقے سے انسانی مزاج میں اور اس کی کمزوریوں، جبلتوں کے سائے میں سے سچ کی الگ الگ شکلوں کو روشنی میں لانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی ان کی شاعری کی عظمت اور خاص بات ہے۔

☆☆☆

504, Century Height, Jat Khedi Road Near Sagrila
Housingh Socirty Bawadiya Kalan Bhopal- 462026
Mobile No. 9630144514

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بلراج بخشی کا افسانہ 'فیصلہ': تجزیہ مطالعہ

■ ڈاکٹر شاہد جمیل، پٹنہ

افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں قارئین بڑے افسانہ نگار کو اُسی طرح پہچان لیتے ہیں، جس طرح مائیں اسکول میں چھٹی کے وقت اپنے اپنے بچے کو۔ فقط بارہ افسانوں پر مشتمل ایک مجموعہ ('ایک بوند زندگی') چھوڑ کر دارِ فانی سے رخصت ہوئے بلراج بخشی کو بھی اہلیانِ نظر نے پہچان لیا کہ وہ ایک بڑے افسانہ نگار تھے اور اُنھوں نے ذخیرۂ ادب میں بھی اضافہ کیا ہے۔

یہ سچ ہے! واقعات کو فنی پیرائے میں افسانے میں منتقل کرنا کارِ دشوار نہیں، لیکن افسانے کو فنی نمونہ بنانا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ایک ذود حس کثیر المطالعہ صاحبِ علم و دانش اور کہانی گڑھنے کی استعداد سے متصف قلمکار، جس کا مشاہدہ عمیق اور تجربہ پختہ تر ہو، جو صاحبِ زبان و بیان ہو اور اختصار میں جامعیت پیدا کرنے کا ہنر رکھتا ہو، وہی افرادِ معاشرہ اور واقعات کے توسط سے بہترین کہانیاں گڑھ سکتا ہے۔ یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ ہر بڑے افسانہ نگار کے سبھی افسانے اہم اور لازوال نہیں ہوتے۔

بلراج بخشی ایک صاحبِ طرز منفرد و ممتاز افسانہ نگار تھے اور اُنھوں نے فقط بارہ افسانوں (بالترتیب 'فیصلہ'، 'ڈیتھ سٹرفکیٹ'، 'زچ'، 'مشترکہ اعلامیہ'، 'مکتی'، 'کیا نہیں ہوسکتا'، 'مکلاوہ'، 'گرفتہ'، 'کھانسی ایک شام کی'، 'ہارا ہوا محاذ'، 'چور' اور 'ایک بوند زندگی') سے ذخیرۂ افسانہ میں قابلِ ذکر اضافہ کیا ہے۔ قارئین کے حافظے میں زیر تجزیہ افسانہ موجود ہونا چاہئے لہٰذا 'فیصلہ' کے اہم اقتباسات کو پروکر پیش کردہ کہانی ملاحظہ کیجیے:

''سردی ہڈیوں کو چیرتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ جج مظفر علی رانا نے لحاف کو اور کس کر اپنے گرد لپیٹا، شیر چائے کی چسکی لی اور ٹیلیوژن کی طرف دیکھا...... میزبان کہہ رہا تھا: ''آج بارہویں دن بھی بھدرواہ کے علاقے کا باقی ملک سے زمینی رابطہ کٹا رہا......''

سرکاری اردلی سلیمان تھا جو صبح سے شام تک گھر اور عدالت میں اس (جج رانا) کے ساتھ رہتا تھا...... پانچ دنوں سے اس (جج رانا) کی زبان گوشت کی ایک بوٹی کے لئے ترس گئی تھی...... راستے میں رانا کو کوئی لوگ ملے جو ادب سے سلام کرکے احتراماً سامنے سے ہٹ گئے...... اچانک ایک طرف سے کچھ شور سنائی دینے لگا جو بتدریج بڑھتا ہی گیا۔ رانا نے اُدھر مُڑ کر دیکھا...... دو ڈھائی کلو وزنی یہ جنگلی مُرغ بلائی خطے میں شدید برفباری برداشت نہ کرسکنے کی وجہ سے نیچے بستی میں بھٹک گیا تھا۔ جج مظفر علی رانا للچائی نظروں سے اسے دیکھنے لگا...... اچانک اسے فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز مہک سی آئی...... اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ بے قابو ہوکر بولا: ''سلیمان...... اسے کوئی نہ کوئی تو پکڑ ہی لے گا...... جتنے روپے مانگتا ہے، دے کرلے آنا...... جاؤ......''

پونے نو بجے جج مظفر علی رانا اپنے چیمبر میں تھا۔ اس نے حیرت سے دیکھا کی کمرۂ عدالت کی ایک بے سلاخ کھڑکی پر وہی مرغ کھڑا تھا...... ایک انتہائی مختصر سی اڑان کے ساتھ وہ کڑکڑاتے ہوئے کمرۂ عدالت میں آکر سراسیمگی سے چاروں طرف دیکھنے لگا...... جج رانا نے دیکھا کہ اس کا اردلی سلیمان دبے پاؤں چلتا ہوا عدالت کے کمرے کی کھڑکیاں بند کر رہا تھا اور عدالت کا ایک چپراسی بھی اس کے ساتھ تھا...... سلیمان نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا تھا...... اس پر تقریباً بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر چپراسی سے ہانپتے ہوئے بولا: ''چھری...... چھری لاؤ...... جلدی......''

بقا کی طویل جدوجہد نے اسے تھکا دیا تھا...... اس کی چونچ جج رانا کی طرف اُٹھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں رانا کی جانب دیکھتی محسوس ہورہی تھی۔ کیا یہ میری طرف دیکھ رہا ہے، رانا نے حیرت سے سوچا اور لمحے بھر کو لگا وہ واقعی اُسی کو دیکھ رہا ہے...... جب سلیمان اس کے گلے پر چھری پھیرنے ہی والا تھا کہ رانا بے اختیار چیخ پڑا: ''ٹھہرو......'' سلیمان نے ہاتھ روک کر حیرت سے دیکھا...... اسے چھوڑ دو...... یہ عدالت ہے ذبح خانہ نہیں...... اسے چھوڑ دو...... آزاد کردو......'' سلیمان بے یقینی سے اس کی طرف کچھ دیر دیکھتا رہا لیکن پھر آنکھوں میں ارادے کی پختگی دیکھ کر کھڑکی کی طرف بڑھا...... جج نے کہا: ''اُدھر نہیں...... اِس طرف'' رانا نے سامنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جو نیچے ڈھلان کی طرف کھلتی تھی اور خود بھی کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوگیا...... رانا نے دیکھا کہ پنکھ پھڑپھڑاتے ہوئے مرغ سلامتی سے برف پر اتر گیا...... یہ اس کا مانوس منظر نامہ تھا۔ پھر اس نے پیچھے مُڑ کر کھڑکی سے جھانکتے ہوئے رانا کو دیکھا۔ کیا یہ میری طرف دیکھ رہا ہے؟ رانا نے سوچا۔

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

کیا اسے احساس ہے کہ میں نے اس کو یقینی موت سے بچایا ہے......مرغ واپس مڑ کر کچھ قدم چلا لیکن پھر رک کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا......اچانک مرغ نے سر اٹھا کر دو فلک شگاف بانگیں لگائیں پھر کچھ دیر بعد ایک جھٹکے کے ساتھ واپس مڑا اور بڑے اعتماد کے ساتھ چھلانگیں لگاتا ہوا ڈھلان پر اترتا چلا گیا......

وہ (جج رانا) اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر......کورٹ کلرک سے بولا: ''نیکسٹ کیس......''

'فیصلہ' مجموعے کا پہلا اور ایک بڑا افسانہ ہے۔ شموئل احمد کی طرح بلراج بخشی بھی اکثر مجھے تازہ تخلیق ٹیلی فون پر سنایا کرتے اور تادیر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ اس افسانے پر بھی موصوف سے تبادلۂ خیال ہوا تھا۔ دورانِ گفتگو منکشف ہوا تھا کہ بلراج بخشی زود نویس نہیں اور تخلیق کے تئیں ان کا رویہ بے حد محتاط تھا۔ وہ تخلیق کی تکمیل کے بعد بھی کئی بار ناقدانہ نظر ڈالتے اور تخلیق کو فن بنانے کی شعوری کوشش کرتے تھے۔ اُنھیں اپنے فن پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ اشاعت کے معاملے میں عجلت پسند نہیں تھے۔

بلراج بخشی میں کہانی گڑھنے کا ہنر بدرجۂ اتم تھا۔ وہ قاری کو کہانی پڑھاتے نہیں، دکھاتے تھے۔ اندازِ بیان کی روانی کے سبب قاری افسانے کو ایک ہی نشست میں پڑھ لیتا ہے۔ بلراج بخشی موضوع کا انتخاب کر کے مواد افسانہ کو ذہن میں مدتوں پکاتے تھے۔ پلاٹ سازی میں بھی وہ مشاق تھے لہٰذا واقعات کو اس طرح پیش کرتے کہ ہر واقعہ پلاٹ کا جزولاینفک بن جاتا۔ وہ کسی واقعے کے وقوع پزیر ہونے سے قبل ایسی فضا بندی کرتے کہ واقعہ فطری طور پر ظہور میں آتا اور عہد و معاشرہ کا عکاس بن جاتا۔ شناسا کرداروں کا انتخاب کرتے اور اُن کی سیرت سازی پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ جذبات نگاری اور منظر کشی میں بھی اُنھیں مہارت حاصل تھی۔ اِسی سبب ضمنی کردار بھی قاری کے حافظے میں محفوظ رہ جاتے اور پورا منظر آنکھوں کے سامنے رقص کر جاتا ہے۔ وہ انسانی نفسیات کے بھی نباض تھے۔ لہٰذا ان کے مکالمے سیرت ساز ہوتے ہیں۔ اس افسانے کو ہم علامتی افسانے کے زمرے میں نہیں رکھ سکتے جب کہ عدلیہ، جج، جان بچاتے مرغے کا کمرۂ عدالت میں پناہ لینا، مرغے کا جج کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھنا اور آزادی کے بعد مرغے کا بانگیں لگانا جیسے بلیغ علامتی اشارے موجود ہیں۔

بلراج بخشی نے اس افسانے کا عنوان 'فیصلہ' رکھا ہے۔ ممکن ہے، وہ بھی عہدِ حاضر کے غیر متوقع عدالتی فیصلے کی طرح قاری کو چونکانا چاہتے ہوں۔ لیکن 'بانگ' زیادہ مناسب عنوان ہوتا کہ قاری کو یہ پیغام ملتا کہ جہاں فیصلے بکتے ہیں، اُسی عدلیہ سے مظلوم کو انصاف ملا اور فیصلے سے مطمئن مرغے نے بطور اظہارِ تشکر دو بانگیں لگائیں۔

مرکزی کردار مظفر علی رانا عہد حاضر کے ججوں کے نمائندہ ہیں۔ خبروں سے باخبر رہنا اور غور وفکر کرنا اُن کا بھی معمول ہے۔ افسانے کے متفرق اقتباسات اُن کی سیرت کے کئی پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں: ''بیگم کو سخت تاکید تھی کہ وہ سرکاری عملے کے آنے کے بعد سامنے نہ آئے اور پیچھے سے آواز بھی نہ لگائے...... جج مظفر رانا للچائی نظروں سے اُسے (جنگلی مرغ) دیکھنے لگا......رانا کے اندر کا پرانا شکاری جاگنے لگا۔ کیوں نہ وہ جھپٹ کر گھر سے بارہ بور کی بندوق لے آئے؟......سوچا، گزشتہ بیس برسوں میں ملی ٹینسی بڑھنے سے اب فائر کرنا تو درکنار، لائیسنس یافتہ بندوق لے کر چلنا بھی دشوار تھا...... اگر یہ ہاتھ آجائے تو...... یہ غلط بات ہے کہ سلیمان نے اس کے خیالات پڑھ لیے، اس نے سوچا، ایک جج کو اپنے عہدے کا وقار رکھنا چاہیے...... بے قابو ہو کر بولا: ''سلیمان......اسے کوئی نہ کوئی تو پکڑ ہی لے گا...... جتنے روپے مانگتا ہے دے کر لے آنا...... جاؤ......ان آٹھ برسوں میں اس کے پاس بہتری پیشکشیں آئیں اور کئی معاملات میں اس نے انکار بھی نہیں کیا ......اس نے کبھی بے انصافی نہیں کی اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ آج بھی ایک ایسا ہی مقدمہ درپیش تھا جس کے لئے اسے ایک وافر پیش کش کی گئی تھی اور اس نے حامی بھر لی تھی کیونکہ اس نے یوں بھی اسی فریق کے حق میں فیصلہ سنانا تھا...... اسے چھوڑ دو...... یہ عدالت ہے ذبح خانہ نہیں......اسے چھوڑ دو آزاد کردو......اُدھر نہیں...... اِس طرف' رانا نے سامنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جو نیچے ڈھلان کی طرف کھلتی تھی...... پھر کورٹ کلرک سے بولا: ''نیکسٹ کیس......''

جج مظفر علی رانا کا اپنی اہلیہ کو تنبیہ کرنا، آلو پراٹھے پر اکتفا کرنے والے گوشت خور کا، مرغ دیکھ کر فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز مہک سے بے قابو ہو کر کہنا ''اگر یہ ہاتھ آجائے تو......'' پھر سلیمان کے بھانپ لینے پر یہ سوچنا کہ ایک جج کو اپنے عہدے کا وقار رکھنا چاہیے۔ لیکن خواہش کے زیر اثر اپنے اردلی کو حکم دینا کہ وہ منہ مانگی قیمت پر گرفتہ مرغ کو حاصل کرے، اُس کی

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

خود احتسابی اور ذبح ہوتے اور آزاد مرغے کو اپنی جانب دیکھتے ہوئے یہ سوچنا کہ وہ ملتجی اور ممنون نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہا ہے۔ اُسے محفوظ جانب کی کھڑکی سے آزاد کرانا۔ پھر اپنے روٹین ورک میں لگ جانا دراصل جج مظفر علی رانا کی شخصیت اور اُن کی نفسیات کے آئینہ دار ہیں۔ یہی فنی پختگی اور ہنر مندی بلراج بخشی کو بھی بڑے افسانہ نگاروں میں شمار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔

اردلی سلیمان ایک ضمنی کردار ہے۔ وہ بھی شہاب ثاقب کی طرح آنکھوں کو خیرہ کر کے ذہن میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ جج کے منشا کو بھانپ لینا اور حکمِ آزادی کے وقت اُس کا متحیر ہونا اُس کی نبض شناسی کو اُجاگر کرتا ہے۔ جنگلی مرغ بھی ایک ضمنی کردار ہے، جس کی بے زبانی بھی بہت کچھ بولتی ہے۔

اِس افسانے کا بین السطور بہت واضح ہے۔ مظلومین کا آخری سہارا عدلیہ ہے، جہاں متفرق خیالات کے جج ہوتے ہیں۔ اُن میں ایک انصاف دینے اور دوسرا من چاہا فیصلے لینے کے لئے رشوت لیتا ہے۔ جج مظفر علی رانا انصاف دینے کے لئے رشوت لیتا ہے۔ جنگلی مرغ اقلیتی طبقہ کا نمائندہ ہے، جس کی زندگی کہیں محفوظ نہیں۔ جہدِ بقا اُس کا مقدر ہے۔ انصاف ملنے کی آخری اُمید عدلیہ اور جج سے وابستہ ہے۔ جہاں صادر بیشتر فیصلے چونکاتے اور مایوس بھی کرتے ہیں۔ اِس کے باوجود یہی جائے پناہ بھی ہے۔ دشمنوں کے نرغے میں پھنسا مرغ جان کی امان کی خاطر عدالت جا پہنچتا۔ انصاف کے سبب ملی رہائی کے بعد وہ مُڑ مُڑ کے جج مظفر علی رانا کو دیکھتا اور دو بانگیں لگا کر اُن کا اور عدلیہ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ جج صاحب کا گرفتہ مرغے کو دیکھ کر یہ سوچنا کہ وہ ملتجی نگاہوں سے اُسے ہی دیکھ رہا ہے اور آزادی کے بعد مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہوئے وہ بانگیں لگا رہا ہے۔ اِس سچ کا مُظہر ہے کہ جج بکاؤ ہو جائیں پھر بھی مظلومین بالخصوص اقلیتی طبقہ کو عدلیہ سے ہی انصاف کی توقع ہے اور غیر متوقع فیصلے اُنھیں بھی سرخوشی بخشتے اور اظہارِ تشکر کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

بعض افسانہ نگار اپنے علم و آگہی کو 'مور پنکھ' کی طرح قصّے میں کھونس دیتے ہیں، جنھیں حذف کر دیا جائے تو افسانے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلراج بخشی نے بھی نے بھی کئی جگہوں پر متفرق جانکاریاں دی ہیں۔ مثلاً شیر اور نون چائے کے ضمن میں سموار کی تفصیل۔ کلچر اور جدید تکنالوجی، بھدرواہ کی تاریخ و جغرافیہ اور ملی ٹینسی کے اثرات وغیرہ۔ یہ معلومات افزا ضرور ہیں لیکن پلاٹ میں کھونسے گئے مور پنکھ کی طرح۔

بلراج بخشی کی زبان شستہ ورواں اور بامحاورہ بھی ہے۔ نیز جملے سازی پر بھی وہ خصوصی توجہ صرف کرتے ہیں۔ برائے ملاحظہ:

''آلو پراٹھے، اس نے برا سا منہ بنایا...... پانچ دنوں سے اس کی زبان ایک بوٹی کے لیے ترس گئی تھی......انسان سے بہتر شکاری اور کوئی نہیں تھا اور یہ مرغ بھی اب واضح طور پر تھک چکا تھا...... مزاحمت کے مرحلوں سے گزر کر اب وہ شاید تن بہ تقدیر ہو گیا تھا......''

افسانے میں ڈرامے کا عنصر ہو تو کہانی متحرک ہوتی ہے۔ بلراج بخشی اِس نکتے سے واقف تھے۔ ملاحظہ کیجئے: ''سلیمان ایک پاؤں اس کے پھنسے پنکھوں پر اور دوسرا اس کی ٹانگوں پر رکھ کر تقریباً بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر چپراسی سے ہانپتے ہوئے بولا: چھری ...... چھری لاؤ......جلدی......چپراسی باہر بھاگا......اچانک مرغ نے سر اٹھا کر دو فلک شگاف بانگیں لگائیں پھر کچھ دیر بعد واپس مُڑا اور بڑے اعتماد کے ساتھ چھلانگیں لگاتا ہوا ڈھلان پر اترتا چلا گیا۔''

مکالمہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ گفتگو سے کردار کے اعمال وافکار کے ساتھ اُن کی نفسیات بھی منعکس ہوں۔ افسانہ نگار جذبات نگاری کے توسط سے کردار کی نفسیات، ذہنی کیفیات اور احساسات کو پیش کرتا اور جزئیات نگاری اُس کے مشاہدات کو منعکس کرتی ہے۔ یہ بھی کارِ دشوار ہے۔ جج مظفر علی رانا اور ان کا اردلی سلیمان دونوں کے مکالمے سیرت ساز ہیں۔ بلراج بخشی نے دل کو چھو لینے والی جذبات نگاری پیش کی ہے اور جزئیات نگاری سے بھی متاثر کیا ہے۔ تجزیے میں پیش کردہ اقتباسات میں ان کے ثبوت موجود ہیں۔

افسانے کا اختتامیہ جملہ ''نیکسٹ کیس'' انتہائی معنی خیز ہے۔ یعنی عدالتیں فیصلہ سنا کر اس کے درعمل سے بے نیاز ہو کر اگلی سماعت پر توجہ مرکوز کر لیتی ہیں۔ المختصر بلراج بخشی کا افسانہ 'فیصلہ' کا شمار اردو کے بہترین افسانوں میں ہوگا کہ اس میں بڑے افسانے کی بیشتر خصوصیات موجود ہیں۔

☆☆☆

Mohiuddin Enclave,
1st Floor, Flat no. 789,
New Patliputra Colony Patna- 800013
Mobile no. 8825296137

بلراج بخشی کا افسانہ ’ایک بوند زندگی‘: تجزیاتی جائزہ

■ پرویز مانوس، کشمیر

افسانہ ’ایک بوند زندگی‘ بلراج بخشی کی تخلیقی فکر اور علامتی انداز کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ کہانی انسانی جدوجہد آزادی کی خواہش اور سماجی جبر کے خلاف بغاوت کی عکاسی کرتی ہے۔

افسانہ ’ایک بوند زندگی‘ بلراج بخشی کی ایک گہری تمثیلی تحریر ہے، جو آزادی، انسانی وجود، اور سماجی جبر کے مابین کشمکش کو موضوع بناتی ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان اپنی ذہنی اور فکری آزادی کے بغیر ادھورا ہے اور جب سماج یا کوئی نظام انسان کی انفرادیت، شعور اور آزادی کو پابند کرتا ہے تو وہ انسانیت کے بنیادی جوہر کو ختم کر دیتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار انفرادی آزادی کے حصول کے لیے سماجی جکڑ بندیوں اور روایتی نظام سے فرار کی جدوجہد کرتا ہے۔ لیکن یہ جدوجہد نہ صرف تھکن، زخمی جسم اور اذیت میں ڈھل جاتی ہے بلکہ سماج کے قائم کردہ قوانین اور طاقتور قوتیں اسے دوبارہ اپنی گرفت میں لے آتی ہیں۔ یہ کہانی استبدادی معاشروں میں آزادی کے لیے کوشش کرنے والے افراد کی جدوجہد کو علامتی انداز میں پیش کرتی ہے، جہاں آزاد سوچ کو دبانے کے لیے روایتی طاقتیں متحرک رہتی ہیں۔

بلراج بخشی کے افسانے ’ایک بوند زندگی‘ کا پلاٹ ایک تمثیلی اور علامتی انداز میں ترتیب دیا گیا ہے، جو آزادی، انسانی جدوجہد، اور جبر کے گرد گھومتا ہے۔

کہانی کا آغاز ایک ایسے ماحول سے ہوتا ہے جہاں مرکزی کردار ایک قید میں ہے۔ یہ قید نہ صرف جسمانی ہے بلکہ ذہنی اور روحانی طور پر بھی اس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے۔ کردار ایک ایسی زندگی گزار رہا ہے جس میں آزادی کی کوئی گنجائش نہیں۔

مرکزی کردار قید سے فرار کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ آزاد فضا میں سانس لینے، اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے اور اپنی انفرادیت کو محسوس کرنے کا متمنی ہے۔ اس خواہش کے تحت وہ سماجی جکڑ بندیوں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔

افسانہ ’ایک بوند زندگی‘ کا کردار قید سے بھاگ نکلتا ہے اور کھلے میدان، پہاڑوں، اور جنگلوں میں چھپتا پھرتا ہے۔ اس دوران وہ آزادی کی تازگی اور نئی زندگی کا خواب دیکھتا ہے۔ لیکن یہ سفر آسان نہیں ہوتا۔ اسے مختلف رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جو اس کی جسمانی اور ذہنی توانائی کو ختم کر دیتی ہیں۔ کردار کی آزادی کی کوشش زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ وہ طاقتیں جو اسے قابو میں رکھنا چاہتی ہیں، اسے دوبارہ پکڑ لیتی ہیں۔ یہ قابض قوتیں نہ صرف اسے جسمانی طور پر قید کرتی ہیں بلکہ اس کی روحانی آزادی کو بھی ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

بلراج بخشی کی اس کہانی کا اختتام ایک کھلے سوال پر ہوتا ہے۔ کردار کی قید اور فرار کی یہ جدوجہد کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچتی، بلکہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ آزادی کی یہ جدوجہد ایک دائمی عمل ہے۔ قیدی دوبارہ اپنی جگہ پر لوٹ آتا ہے اور آزادی کی جستجو ایک نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔

افسانہ ’ایک بوند زندگی‘ کا پلاٹ علامتی اور تمثیلی انداز میں انسانی زندگی کی ان کوششوں کو پیش کرتا ہے جو آزادی اور خود مختاری کے حصول کے لیے کی جاتی ہیں، لیکن اکثر سماجی جبر اور نظام کی سختیوں کے آگے ناکام ہو جاتی ہیں۔ یہ کہانی قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ حقیقی آزادی کیا ہے اور کیا یہ ممکن بھی ہے؟

بلراج بخشی کے افسانے ’ایک بوند زندگی‘ کا موضوع انسانی آزادی کی جدوجہد، جبر کے خلاف مزاحمت، اور زندگی کے بنیادی حق کی تلاش ہے۔ یہ افسانہ انفرادی آزادی، سماجی نظام کی قیود اور انسانی خواہشات کے درمیان جاری کشمکش کو علامتی انداز میں پیش کرتا ہے۔

انسان کی فطری خواہش ہے کہ وہ آزاد ہو، چاہے وہ جسمانی ہو یا روحانی۔ افسانہ اس جدوجہد کو ظاہر کرتا ہے جو ایک

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

شخص اپنی آزادی کے لیے کرتا ہے۔

کہانی ان قوتوں کو اُجاگر کرتی ہے جو انسان کو اس کی آزادی سے محروم کرتی ہیں، چاہے وہ سماجی نظام ہو، سیاسی جبر ہو، یا نفسیاتی رکاوٹیں۔ کہانی کا عنوان 'ایک بوند زندگی' خود ہی اشارہ دیتا ہے کہ زندگی ایک قیمتی لیکن نازک چیز ہے، جسے قید یا جبر سے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ افسانہ یہ دکھاتا ہے کہ آزادی کے لیے جدوجہد کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ یہ موضوعات انسانی زندگی کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں کو بیان کرتے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ حقیقی آزادی اور زندگی کا مفہوم کیا ہے۔ یہ انسانی آزادی کی خواہش اور جبر کے خلاف بغاوت کی علامت ہے۔ وہ تمام مشکلات کے باوجود اپنی آزادی کے لیے لڑتا ہے، جو انسانی روح کی بے پناہ طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔

انداز بیان: افسانے میں آزادی، جبر، اور زندگی جیسے موضوعات کو علامتوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ 'بوند' ایک اہم علامت ہے جو زندگی کی نرمی، نزاکت اور قید سے بچنے کی خواہش کو ظاہر کرتی ہے۔ اس علامتی انداز نے کہانی کو گہری معنویت دی ہے۔ بلراج بخشی کا انداز شاعرانہ اور پراثر ہے۔ ان کے جملے مختصر لیکن معنی خیز ہیں، جن میں الفاظ کی چناؤ سے جذبات اور احساسات کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا اسلوب قاری کو ایک گہرے جذباتی اور فکری تجربے سے گزارتا ہے۔ فسانے میں تشبیہات اور استعارات کا استعمال نمایاں ہے، جو کہانی کے بیان کو خوبصورتی اور گہرائی فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً 'بوند' کا استعارہ نہ صرف زندگی کی نرمی بلکہ آزادی کی خواہش کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

حقیقت نگاری: بلراج بخشی کا اسلوب حقیقت پسندانہ ہے۔ وہ سماجی مسائل کو نہایت حساسیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کو قاری کے سامنے بے نقاب کرتے ہیں۔ بیان میں گہرائی اور سنجیدگی موجود ہے۔ کہانی قاری کو سوچنے اور جذباتی طور پر شامل ہونے پر مجبور کرتی ہے۔

کردارنگاری: افسانے میں کرداروں کی وضاحت علامتی انداز میں کی گئی ہے، جوان کے جذبات اور اندرونی کشمکش کو ظاہر کرتی ہے۔ مختصراً یہ کہ بلراج بخشی کا اسلوب علامتی اور شاعرانہ ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت پسند بھی ہے۔ ان کا بیان قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور کہانی کے جذباتی اور فکری پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔

منظر کشی: بلراج بخشی کے افسانے 'ایک بوند زندگی' میں منظر کشی کا پہلو نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ نہ صرف کہانی کے ماحول کو واضح کرتی ہے بلکہ قاری کے ذہن میں جذباتی اور فکری اثر بھی چھوڑتی ہے۔ بخشی نے اپنے منفرد انداز میں قدرت، انسانی احساسات، اور سماجی جبر کی عکاسی کی ہے۔ کہانی میں 'بوند' کی تصویر کشی ایک علامت کے طور پر کی گئی ہے۔ بوند کے قطرے کا گرنا، اس کا آزاد ہونا اور دوبارہ قید میں آجانا ایک گہری علامتی منظر کشی ہے، جو زندگی کی نرمی اور جبر کی شدت کو ظاہر کرتی ہے۔ بخشی نے قدرت، انسانی جذبات، اور سماج کے جبر کو ایک گہرے اور معنی خیز انداز میں پیش کیا ہے، جو کہانی کو قاری کے ذہن اور دل میں زندہ رکھتی ہے۔

بحیثیت مجموعی 'ایک بوند زندگی' ایک گہرے معنوی اور جذباتی اثرات کا حامل افسانہ ہے، جو قاری کو زندگی کی خوبصورتی، جدوجہد، اور آزادی کے حقیقی معنی سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ بلراج بخشی کی تحریر قاری کے دل میں گہری چھاپ چھوڑتی ہے اور اسے ایک منفرد فکری اور جمالیاتی تجربہ فراہم کرتی ہے۔ افسانے کا مجموعی تاثر ایک گہری فکری دعوت ہے۔ قاری کہانی پڑھنے کے بعد زندگی کے بنیادی سوالات، انسانی خواہشات، اور سماجی جبر پر غور کرتا ہے۔ یہ کہانی قاری کو اپنی زندگی کی حقیقتوں پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

☆☆☆

H No. 115, Azad Basti Natipora West
Srinagar, Kashmir- 190015
Mobile No. 9419463487

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بلراج بخشی کا افسانہ 'زچ': ایک تجزیہ

■ محمد نعیم یاد، پاکستان

بلراج بخشی اُردو ادب کے ان معدودے چند تخلیق کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے افسانوی فن کو فکری گہرائی، جمالیاتی نزاکت اور حقیقت نگاری کی آمیزش سے ایک منفرد رنگ عطا کیا۔ وہ اُردو فکشن میں ایک ایسے اسلوب کے حامل ہیں جو زندگی کے تلخ ترین سوالات سے آنکھیں ملانے کی جرات رکھتا ہے اور انسانی رشتوں، نفسیاتی پیچیدگیوں اور سماجی جبر کو بے نقاب کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ان کے افسانے محض بیانیہ کہانیاں نہیں، بلکہ انسانی ذہن، جذبات اور شعور کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہیں۔ ان کے تخلیقی سفر میں ان کے افسانے 'زچ' کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے، جو انسانی فطرت، معاشرتی اقدار، اور سائنسی ترقی کے مابین ایک کربناک کشمکش کو پیش کرتا ہے۔

افسانہ 'زچ' ایک ایسے موضوع کو اجاگر کرتا ہے جو انسانی وجود کے نہایت بنیادی سوالات میں سے ایک ہے۔ مردانگی، تولیدی صلاحیت، ازدواجی رشتے، سائنسی مداخلت، اور سماجی دباؤ جیسے نازک مگر اہم موضوعات کو بلراج بخشی نے نہایت مہارت اور باریک بینی سے برتا ہے۔ ساحل اور خوشبو کی ازدواجی زندگی، ان کے درمیان محبت اور جسمانی تعلق کے باوجود، ایک ایسی کمی کا شکار ہے جسے معاشرہ معاف نہیں کرتا۔ مردانگی کے تصور کو تولیدی صلاحیت کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جائے تو ساحل جیسے کرداروں کی ذہنی کشمکش واضح ہو جاتی ہے، جو بظاہر ایک کامیاب، خوشحال اور ترقی پسند انسان ہے، مگر ایک ایسے طبی مسئلے کا شکار ہے جو نہ صرف اس کی ذاتی زندگی کو متاثر کر رہا ہے بلکہ اس کی سماجی حیثیت کو بھی داؤ پر لگا رہا ہے۔

افسانے میں ڈاکٹر سامی کا کردار ایک طبیب کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی ترقی کے نمائندے کے طور پر بھی ابھرتا ہے۔ وہ ساحل اور خوشبو کے مسئلے کا سائنسی حل تجویز کرتا ہے، جو جدید دنیا میں ایک عام سی بات سمجھی جاتی ہے، مگر روایتی معاشرتی اقدار اور شخصی نفسیات کے تناظر میں یہ حل کتنا پیچیدہ اور حساس ہو سکتا ہے، یہی اس افسانے کا بنیادی سوال ہے۔ ساحل کا ردِعمل، اس کی ہچکچاہٹ، اس کا احساسِ شکست، اور اس کے متبادل حل تلاش کرنے کی کوشش دراصل ایک ایسے مرد کی کہانی ہے جو اپنی مردانگی کے سائے میں جینے کا عادی ہے اور جسے معاشرتی دباؤ یہ باور کراتا ہے کہ وہ اس بنیادی فریضے کی ادائیگی میں ناکام ہو چکا ہے جو ایک مرد کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتا ہے۔

افسانے کا ایک نہایت اہم لمحہ وہ ہے جب ڈاکٹر سامی ساحل کو حقیقت سے روشناس کراتا ہے:

"میں صاف صاف ہی کہنے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن یہ ایک عجیب سی سچوئیشن ہے...... صاف بات یہ ہے کہ......آپ کے جسم کا نظام سرے سے Sperms ہی نہیں بناتا......میڈیکل زبان میں اسے Azospermia کہتے ہیں...... اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ حمل نہیں ہو پاتا...... یہ ہے آپ کی پرابلم...... اور اس کا کوئی حل نہیں...... آئی ایم سوری۔"

یہ لمحہ ساحل کی شخصیت میں ایک زلزلہ برپا کر دیتا ہے۔ وہ ایک ایسے مرد کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا جو ہر طرح سے مکمل اور کامیاب تھا، مگر یہ انکشاف اس کے اندرونی وجود کو چکنا چور کر دیتا ہے۔ ساحل کا اضطراب اور خوشبو کی خاموشی دونوں ہی قاری کو اس شدید نفسیاتی الجھن کا احساس دلاتے ہیں جس میں وہ دونوں گھر چکے ہیں۔

یہ افسانہ مردانگی اور نسوانیت کے روایتی تصورات کو چیلنج کرتا ہے۔ عورت کا کردار یہاں محض ایک فرماں بردار شریکِ حیات کا نہیں، بلکہ وہ بھی اپنی خواہشات، خوف، اور کشمکش میں مبتلا ہے۔ خوشبو کا کردار درحقیقت اس پیچیدہ صورت حال کا آئینہ دار ہے جس میں عورت خود کو ایک طرف سائنسی ترقی اور جدید دنیا کے نظریات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

کرتی ہے، اور دوسری طرف اپنے شوہر کے جذبات، معاشرتی دباؤ اور روایتی اقدار کے درمیان پھنسی ہوتی ہے۔ وہ کسی جذباتی یا جسمانی کمزوری کا شکار نہیں، بلکہ ایک عملی خاتون ہے، جو اس مسئلے کا حل چاہتی ہے، مگر ایک ایسا حل جو اسے معاشرتی حقائق اور ازدواجی رشتے میں توازن برقرار رکھنے کی اجازت دے۔

بلراج بخشی کا اسلوب بیانیہ کے ساتھ ساتھ علامتی اور استعاراتی انداز کا بھی حامل ہے۔ افسانے میں محض کرداروں کی گفتگو ہی نہیں، بلکہ ان کے اندرونی خلفشار، ذہنی پیچیدگی اور جذباتی ارتعاش بھی نمایاں ہے۔ ساحل اور خوشبو کے درمیان ہونے والی گفتگو، ان کے خاموش لمحے، ان کی نگاہیں اور ان کے فیصلے سب کچھ قاری کے ذہن میں کئی سوالات کو جنم دیتے ہیں۔

''دیکھو خوش Donor ...... کا رنگ اور قد وغیرہ کو تو کسی حد تک ہم چن سکتے ہیں.... لیکن اس کے خدوخال..... Feature...... کا کیا کریں گے؟ میں نے ڈاکٹر سامی سے بھی بعد میں پوچھا تھا...... لیکن اس نے بھی یہی کہا تھا کہ یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔''

یہ جملے افسانے کی تہہ میں چھپے اس بنیادی مخمصے کو بے نقاب کرتے ہیں جس سے یہ جوڑا گزر رہا ہے۔ سائنس کے فراہم کردہ حل اور انسانی جذبات کے درمیان یہ جنگ محض ایک ازدواجی مسئلہ نہیں، بلکہ ایک گہری سماجی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

افسانے کا اختتام قاری کو ایک الجھن میں چھوڑ دیتا ہے۔ ساحل اور خوشبو کا رشتہ اس تمام تر کشمکش کے بعد کس سمت جاتا ہے؟ کیا وہ سائنسی حل کو قبول کر لیتے ہیں؟ یا ساحل اپنی انا کے باعث ایک متبادل راستہ اختیار کرتا ہے؟ کیا خوشبو ایک ایسی عورت کے طور پر سامنے آتی ہے جو روایتی ازدواجی اصولوں کی قیدی بن کر رہتی ہے، یا وہ خود بھی کسی نئے راستے کی تلاش میں ہے؟ یہ تمام سوالات افسانے کی خوبصورتی کو مزید بڑھاتے ہیں اور اسے ایک ایسا فن پارہ بنا دیتے ہیں جو محض ایک کہانی نہیں، بلکہ ایک فکری مکالمہ ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بلراج بخشی کا یہ افسانہ جدید اردو افسانوی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے، جو نہ صرف ایک سماجی حقیقت کو اجاگر کرتا ہے بلکہ انسان کے اندرونی وجود اور اس کی نفسیاتی ساخت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ان کا اسلوب نہایت شائستہ، گہرائی لیے ہوئے اور ادبی چاشنی سے لبریز ہے۔ وہ الفاظ سے نہیں، بلکہ بین السطور جذبات اور خیالات سے کہانی بُنتے ہیں، جو ایک غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کی علامت ہے۔

افسانہ 'زچ' قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ زندگی کے اُن پہلوؤں پر غور کرے جو شاید عام طور پر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ یہ نہ صرف جدید سائنسی ترقی اور انسانی نفسیات کے درمیان تعلق پر روشنی ڈالتا ہے، بلکہ ازدواجی رشتے، سماجی توقعات اور انفرادی شناخت جیسے مسائل کو بھی اُجاگر کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ افسانہ 'زچ' کسی بھی بین الاقوامی ادبی معیار پر پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور عالمی سطح پر اسے نہ صرف سراہا جا سکتا ہے بلکہ اس پر سنجیدہ مکالمہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

Dastan Manzil, Street No. 6
Naseem Colony, Jawaharabad,
Khushab Pakistan
Mobile No. 3137716609

حادثے اور بھی ہیں شہر میں ہونے والے
آنسوؤں کی نہ کمی ہو کہیں رونے والے

ایسی تہذیب نظر نہیں آنے لگی بچوں میں
نظر آتے نہیں گلیوں میں کھلونے والے

اب کے جو کاٹنی ہے فصل لہو کی بلراج
یہ وراثت مرے اجداد ہیں بونے والے
بلراج بخشی

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

ڈراما ’قانون شکن‘ کا تجزیہ مطالعہ

■ڈاکٹر محی الدین زور، کشمیر

بلراج بخشی اردو شاعری اور فکشن میں ایک منفرد نام ہے۔ وہ ڈرامے بھی لکھتے ہیں مگر بہت کم۔ ان کے ایک ڈرامے ’وطن فرائی‘ کو ریاستی کلچرل اکادمی نے اسٹیج بھی کیا ہے۔ ان کی خاصیت ہے کہ وہ قلم پھونک پھونک کر اٹھاتے ہیں۔ بقول بلراج بخشی کوئی بھی افسانہ یا ڈراما لکھنے میں انہیں کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ کسی بھی موضوع یا پلاٹ کو وہ مدتوں ذہن میں رکھ کر تمام زاویوں سے اس پر سوچتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کی تخلیق اتنی تناور ہو جاتی ہے کہ اس سے نئی نئی شاخیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ لیکن اس سے کئی بار فن پارے کے بوجھل ہونے کے امکانات بھی رہتے ہیں۔ یہی حال ان کے ڈرامے ’قانون شکن‘ کا بھی ہوا ہے۔ انھوں نے اس ڈرامے کا پلاٹ بالکل ہٹ کر وضع کیا، جس سے اس میں نقص بھی پیدا ہوا ہے۔ لیکن روایت سے انحراف بھی کسی حد تک جائز ہے۔

ڈراما ’قانون شکن‘ میں ان کا مقصد ایک عام انسان کی زندگی کا المیہ پیش کرنا ہے۔ یہ عام انسان اگر حساس شاعر ہو تو معاملہ سنجیدہ ہو جاتا ہے کیوں کہ ایک طرف تو وہ سماج کے ہاتھوں بے بس ہوتا ہے اور دوسری طرف سرکار اسے قانون شکن، حکومت دشمن، کسی بھی نظام سے باغی، فساد پسند اور انارکسٹ کہہ کر سلاخوں کے پیچھے کر دیتی ہے۔

آج کل ادب یا دیگر فنون لطیفہ میں کسی تکنیک یا مختلف فنی لوازمات کی قید کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ موضوع یا سوچ کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی کیوں کہ انٹرنیٹ نے سب راز فاش کر دیئے ہیں، کسی بات کی پردہ داری نہیں رہی۔ ادیب بڑی آزادی سے سوچ سکتا ہے اور لکھ سکتا ہے۔ وہ اپنی بات یا زندگی کی تلخ حقیقت آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ تو اس چیز کو اپنانے کے لئے وہ عالمی ادب کو بھی دیکھتا ہے۔ جیسے ڈرامے کی ایک قسم Absurd Theatre یعنی لغوی ڈراما ہے، جس کا بانی کامو ہے۔ اس ڈراما میں ڈراما نگار زندگی کے دونوں پہلوؤں یعنی غم اور خوشی کو ایک ساتھ لیتا ہے۔ تمام انسانی جذبوں کو بے دریغ اسٹیج پر لا کر زندگی کو بد سے بدترین دکھایا جاتا ہے۔ ایسا ڈراما دیکھنے یا پڑھنے کے دوران اس کے کرداروں کی باتیں ہمیں مہمل لگنے لگتی ہیں، مگر تھیٹر سے باہر نکلنے کے بعد ان کی اہمیت ہم پر واضح ہوتی ہے۔ ٹھیک یہی صورت حال بلراج بخشی کے ڈرامے ’قانون شکن‘ کی بھی ہے جس میں مرکزی کردار (یعنی ملزم) کو زندگی کے ہر چوراہے پر انسانی حقوق کی پامالی کرنے والے مختلف لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے احتجاج پر الٹا اسی کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کر جوابدہی کرنی پڑتی ہے۔ بقول فیض:

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

بلراج بخشی کے ڈرامے ’قانون شکن‘ کے پلاٹ پر نظر ڈالیں تو اس ڈرامے کا پہلا سین عدالت میں ہوتا ہے جہاں مرکزی کردار ملزم کو کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا ہے۔ جج اور وکیل اس سے پوچھ تاچھ شروع کرتے ہیں۔ اس پر الزام ہے کہ وہ قانون شکن ہے اور افراتفری، انارکی اور لاقانونیت پھیلاتا ہے۔ جبکہ جج خود اس بات پر اعتراض کرتا ہے کہ اس ملزم کو ہتھکڑی لگائی گئی ہے اور اسے نقاب بھی نہیں پہنایا گیا جو کہ انسانی حقوق کی سراسر خلاف ورزی ہے کیوں کہ ہتھکڑی نہ لگا کر ملزم کو فرار ہونے کا موقع فراہم کرنا اور نقاب لگا کر ملزم کی شناخت کو صیغہ راز میں رکھ کر اسے جرم کرنے کے مزید مواقع فراہم کرنا انسانی حقوق میں شامل ہے۔ یہ طنز ہے کہ پولیس کی حراست سے مجرم کیسے فرار ہو جاتے ہیں اور گرفتار ہوتے ہی ملزمین کے لئے نقاب کون سپلائی کرتا ہے۔ جج اس بات پر اعتراض کرتا ہے کہ اسے ہتھکڑی میں لایا گیا ہے اور اسے فرار ہونے کا موقع نہیں دیا گیا۔ جبکہ حکومت ہر ہتھکڑی کے ساتھ نقاب بھی فراہم کرتی ہے تاکہ ملزم کو مزید جرم کرنے کا موقع ملے اور قانون کا سلسلہ چلتا رہے۔

دوسری طرف ملزم کا کوئی وکیل صفائی نہیں ہے بلکہ وہ اپنا کیس خود لڑنا چاہتا ہے کیوں کہ سب کچھ بکاؤ ہے اور اسے کسی پر اعتماد نہیں۔ دوسرے ہی سین میں کہانی فلیش بیک میں چلی جاتی ہے۔ ملزم کے خلاف لگے الزام کی گواہی سب سے پہلے ایک بس کنڈکٹر دیتا

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

ہے جب بس کے اندر ایک جگہ 'سواری اپنے سامان کی خود ذمے دار ہے' لکھا ہوا دیکھ کر ملزم نے دوسرے مسافروں کو کنز یومر ایکٹ سمجھا کر انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگانے کے لئے اکسایا۔ ملزم کا اعتراض یہ تھا کہ جب پسنجر بس کا کرایہ ادا کر دیتا ہے تو اس کے سامان کی حفاظت کی ذمے داری بھی بس والے کی ہونی چاہیے۔

تیسرا سین عدالت میں کھلتا ہے جس میں ملزم پر الزامات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے۔ کنڈکٹر کے بعد ایک پبلک پارک کا مالی اس پر پھول توڑنے کا الزام لگاتا ہے اور پھول توڑنے کا جواز ملزم یہ دیتا ہے کہ وہ ایک شاعر ہے اور پھول اسے متاثر کرتے ہیں۔ چھٹے سین میں سپاہی نے اسے نو پارکنگ زون میں بلا کسی جواز کے کھڑے ہونے سے منع کر کے کسی ممکنہ جرم کے ارتکاب کو روکا تو اس بات کو لے کر ملزم وہیں دھرنے پر بیٹھ جاتا ہے۔ سپاہی کی فرض شناسی پر جج اس کے لئے ایوارڈ کی سفارش کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک چائے والا اس پر الزام لگاتا ہے کہ اس نے دکان پر پنکھا نہ چلنے پر ہنگامہ کھڑا کیا اور بات بڑھا کر چائے والے نے اس کو سیاسی گفتگو (جس کی اجازت چائے والے کی دُکان پر ان کے اصولوں کے مطابق نہیں تھی) کرنے کا الزام لگایا۔ لیکن بھری عدالت میں ملزم نے کہا کہ دُکان میں یہ بورڈ لگا دینا کہ یہاں سیاسی گفتگو کرنا منع ہے، انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے کیوں کہ:

"ملک کی سیاسی یا سماجی صورت حال پر اظہار خیال کرنا میرا آئینی حق ہے۔ آئین نے مجھے تحریر و تقریر کی آزادی دی ہے......"

ملزم کے خلاف FIR نمبر چار اس لئے درج کی گئی تھی کہ وہ فریڈم پارک نام کے ایک پارک میں (جس کا نام بعد میں اینٹی نیشنل پارک رکھا گیا) بیٹھ کر ایک لڑکی کو گھورنے کا جرم کر رہا تھا۔ اس زمانے کا پارک اس وقت slum بنا ہے جب بھری عدالت میں [illegible] ملزم کے [illegible] خیالات اور اس کے بیانات سے [illegible] [illegible]

انسانوں کی بے قدری کے حوالے سے مصنف نے جج اور ملزم کے درمیان بہت چبھتے ہوئے مکالمے ہیں جن میں ایبسرڈ مکالموں کا عنصر پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

''ملزم : ہیلتھ کارڈ کے باوجود ان کا مقابلہ ان غیر ملکی کتوں سے نہیں کیا جا سکتا جن کا معیار زندگی یہاں کے انسانوں سے بھی بہتر ہوتا ہے۔

جج : کیا تمہیں پتہ نہیں کہ مقامی کتوں کو، ان کی اقتصادی پسماندگی کے بارے میں بھڑکا کر، انہیں بے اطمینانی، اور غیر ملکی کتوں کے خلاف منافرت پھیلانے کی کوشش میں تم پر مزید فرد جرم عاید ہو سکتی ہے؟

وکیل : آوارہ کتا؟...... یور آنر، اگر روزی روٹی کی تلاش آوارگی ہے تو ہاں...... یہ کتے آوارہ ہیں...... یہ سارے لوگ، تم جیسے یہ سارے لوگ جو عمر بھر یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں جاتے آتے رہتے ہیں، سب آوارہ ہیں......''

ایک اور جگہ :

لڑکی : اینٹی نیشنل تقریریں کر کے آپ انٹرنیشنل میڈیا کے ہیرو بن جاتے ہیں۔ انسانی حقوق کی کمیٹیاں آپ کے گھر پر گیس سلنڈر پہنچاتی ہیں۔ ڈینگو کے مچھروں پر چھڑکاؤ کے لئے آپ کے گھر پر سرکاری ٹیم آ جاتی ہے اور سکیورٹی کے لئے سپاہی مل جاتے ہیں جس سے انسان کا سوشل اسٹیٹس بڑھ جاتا ہے۔"

ملزم کے خلاف عدالت میں آخری گواہ [illegible] اسکواڈ کا ایک ماہر پیش کیا جاتا ہے جس کے پیشے کا تقاضہ ہے کہ وہ بموں کو ناکارہ بنانے کے لئے خطرات مول لیتا رہے اور ان خطرات کا شکار ہو جانے پر اسے یہ معاوضہ ملتا ہے کہ اس کے [illegible] پر بندوقوں کے فائروں سے اسے سلامی دی جاتی ہے۔ ملزم پر الزام یہ ہے کہ اس نے اس بات کا اعلان کیوں نہیں رکھا کہ [illegible] [illegible] ہے۔ ملزم کا کہنا ہے کہ یہ اس کا [illegible] [illegible] ہے۔

جج ملزم کی اس [illegible] کو [illegible] [illegible]
[illegible]

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بھی خطرے میں پڑسکتی ہے تو ملزم کہتا ہے:

''ویسے بھی میرے بچنے کی گارنٹی ہی کیا ہے..... میرا مرنا تو یوں بھی طے ہے...... یوریا.....اور..... صابن ملا کر بنائے ہوئے دودھ کی چائے پی رہا ہوں..... مویشیوں کو دیے جانے والی دوائیوں کے اِنجکشن لگا کر موٹی کی گئی زہریلی سبزیاں کھا رہا ہوں..... مہنگی اور نقلی دوائیاں کھا کر گھل رہا ہوں..... سیمنٹ کے بغیر بنی سرکاری عمارتوں کے گر جانے پر ان کے ملبے میں اپنی قبر بنا رہا ہوں..... سڑک حادثوں میں کتے کی طرح گاڑی کے نیچے کچلا جا رہا ہوں..... یا تو گلی کے غنڈوں سے گولیاں کھا کے مروں گا..... یا لاک اپ میں پولیس کے ٹارچر سے..... کراس فائرنگ میں ہر روز مارا جا رہا ہوں..... نقلی انکاؤنٹر encounter میں مر رہا ہوں..... فسادوں میں کاٹا جا رہا ہوں..... اس لیے یور آنر..... کسی بس اسٹینڈ پر..... کسی ریلوے اسٹیشن پر..... کسی شاپنگ مال میں..... کسی ٹوائیلٹ میں..... کبھی بھی..... کہیں بھی..... اگر کوئی دھماکہ ہو جائے..... میں اچانک لاش بن جاؤں اور میرے فوٹو پر پلاسٹک کے پھولوں کا ہار لگ بھی جائے..... تو اس میں بُرا کیا ہے.....''

آخر کار جج مختلف گواہوں کے بیانات اور جرائم کے سماجی خدشات کے پیش نظر ملزم کو قانون شکن قرار دے دیتا ہے۔ اسے ہتھکڑی لگا کر باہر لے جایا جاتا ہے۔ سماج، پولیس اور عدالت کے ستائے ہوئے اس بے روزگار شاعر کے ساتھ صرف اس کی محبوبہ یعنی وہ لڑکی ہی رہ جاتی ہے۔ 'قانون شکن' آج کے دور کا ایک المیہ اور ایبسر ڈ ڈراما ہے۔ اس کے کردار ہمارے اور آپ کے سماج سے اخذ کیے گئے۔ اسی لئے ان کرداروں کا کوئی مذہب، نام، یا مقام نہیں دکھایا گیا ہے بلکہ یہ کردار یہاں ایکس وائی زیڈ کے نام سے جانے پہچانے ہو چکے ہیں۔ آپ اپنے اپنے انداز سے ان کرداروں کا نام رکھ سکتے ہیں۔

دوسری طرف اس ڈرامے کا کردار خاص طور پر مرکزی کردار رائیٹر کا یا ہمارا آپ کا آئیڈیئل بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ مصنف نے اس کو ایسا پیش نہیں کیا بلکہ جو آج کا انسان ہے، جو خود بے شک غلطیوں سے پاک نہیں ہے اور زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر جس سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن حکومت یا انتظامیہ اس سے طرح طرح کے مطالبات کی خواہاں ہے۔ اسی لئے یہاں قاتل اور مقتول دونوں اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر کسی کے پاس اپنا اپنا جواز ہوتا ہے جسے دوسرا بے شک تسلیم نہ کرے۔

بلراج بخشی نے اس ڈرامے میں زمان و مکاں کی کوئی قید رکھی ہے نہ کسی ذات یا مذہب بلکہ سماج میں رہنے والے عام انسانوں کے اردگرد کے مسائل کا تانا بانا بُنا ہے جس میں آزادی جمہوریت اور قوانین کا غلط استعمال کیا جاتا ہے۔ اب لوگ آزادی کا مطلب بھی غلط سمجھنے لگے ہیں اور دوسری طرف سیاست میں دخل اندازی سے انسان کا رتبہ ایک دم بڑھ جاتا ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنے اپنے فائدے کی بات کرتا ہے اور پورے نظام کو اپنے طور پر چلانا چاہتا ہے۔ جبکہ حقیقت اصل میں یہ نہیں ہے۔ بلراج بخشی نے اس ڈرامے میں ہی ڈسکورس شروع کیا ہے کہ اب اگر فنی یا ادبی نقطہ نظر سے اس ڈرامے کے متن کا گہرا مطالعہ کیا جائے گا تو یہاں ہمیں ایک ساتھ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے عناصر بھی مل جائیں گے۔ مثلاً مرکزی کردار اپنی بے روزگاری کی وجہ سے کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس سے جگہ جگہ سماج اور نظام کا تصادم پیدا ہوتا ہے اور یہی چیز اس کے اندر معاشرے اور انتظامیہ سے alienation پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی تنہائی جب اپنے نقطہ عروج پر پہنچ جاتی ہے تو وہ بوکھلاہٹ کا بھی شکار ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اتنا ہی بولتا ہے اور حقیقت بیان کرتا ہے کہ اس کی ہر بات یا action سماج کو لغو لگنے لگتا ہے کیوں کہ ہمارے سماج نے ایک social structure قائم کر رکھا ہے جس میں کوئی بھی حقیقت یا نئی بات کھٹکنے لگتی ہے۔

یہ ڈراما ریڈیو یا ٹی وی کے لئے ہی موزوں رہے گا کیوں کہ یہاں کہانی کو بار بار فلیش بیک میں لے جایا جاتا ہے۔ اسٹیج ڈائریکٹر اسٹیج کے ایک طرف عدالت کا مستقل سیٹ بنا سکتا ہے اور دوسری طرف مختلف مناظر کو لیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلراج بخشی کا ڈراما 'قانون شکن' انتظامیہ کی پیدا کردہ تشویشناک صورت حال اور عصری سروکاروں سے نبرد آزما عام انسان کی مجبوریوں اور انتظامیہ کی ناکامی پر ایک کامیاب طنز ہے۔

☆☆☆

Farashgund Budgam Kashmir-191111
Mobile No. 9149773980

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

میرا تخلیقی سفر

■ بلراج بخشی

بھائی سلیم سالک کے اصرار پر جب میں نے یہ سطور لکھنا شروع کیں تو معلوم ہوا کہ میرے تخلیقی سفر کا آغاز دوسروں کے تخلیقی سفر کے ابتدائی حالات وواقعات سے بے شک جداگانہ رہا ہوگا، مگر اس کا محرک وہی تھا جو کم وبیش سب کا ہوتا ہے یعنی اظہارِ ذات۔

ہم جانوروں یا پرندوں کی زبان تو نہیں جانتے لیکن کئی جانوروں اور پرندوں کو مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہوئے سنا جا سکتا ہے۔ کئی پرندے اپنی ماداؤں کو متوجہ کرنے کے لئے رقص کے ذریعے اپنے جذبے کا اظہار کرتے دیکھے گئے ہیں، اس سلسلے میں مور کی مثال واضح ہے۔ ازمنۂ قدیم میں غاروں میں رہنے والا انسان غاروں کی دیواروں پر شکار کے مناظر کی تصاویر بنا کر اظہار کی جبلت کا اظہار کرتا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان ہی جذبات کا اظہار فنون لطیفہ کی شکل میں سامنے آیا۔

اصل میں کئی جبلتوں کے ساتھ اظہار بھی انسان کی بنیادی جبلتوں میں سے ایک ہے جو ہر انسان میں کسی نہ کسی حد تک ودیعت ہے اور جس کا اظہار ہر انسان ہنس کر، گا کر، رو کر کسی نہ کسی صورت میں کر ہی دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

میرے والدین پاکستان کے زیر قبضہ علاقہ پونچھ سے تعلق رکھتے تھے۔ 1947 میں پاکستانی فوج کے پونچھ کے محاصرے کے دوران میرے والدین کو بذریعہ طیارہ پونچھ سے انخلا کروا کر، مظفر آباد اور میر پور سے بچے کھچے ڈیڑھ دو لاکھ پناہ گزینوں کے ساتھ جموں میں اور ہماچل پردیش میں یہاں وہاں لا کر آباد کیا گیا تھا۔

بعد میں مجھے بتایا گیا کہ جموں کے مضافات میں نگروٹہ کے مقام پر ایک خیمے میں 10 دسمبر (سرکاری ریکارڈ میں 7 دسمبر 1949) کو میری پیدائش کا حادثہ ہوا تھا۔ لیکن میرے شعور میں یادداشتوں کا اول ترین سلسلہ ادھم پور سے شروع ہوتا ہے جہاں پر ادھم پور کے پٹھار کی شمالی ڈھلان کے سرے پر سرائے کے پاس دیوک ندی کو جانے والی ڈھکّی (پتھروں کو جوڑ کر بنایا گیا پہاڑی راستہ) کے آغاز میں پانچ چھ کمروں کے درمیان ایک صحن کے درمیان میں نے اپنے آپ کو پایا۔ میں نے دیکھا کہ اس چھوٹی سی دنیا میں میرے والدین، میرے ماموں اپنے اہل خانہ سمیت اور میری دونوں خالائیں رہتی ہیں۔ میرے نانا نانی بھی یہیں ہیں۔ سب کے رسوئی گھر اپنے اپنے ہیں۔ سب لوگ ہنستے کھیلتے، لڑتے جھگڑتے، روٹھتے مناتے وہاں رہ رہے ہیں۔

اندھیرے اندھیرے سے بنا کھڑکیوں کے کمرے تھے جہاں سورج کی روشنی کا بلاواسطہ آنا ممنوع تھا۔ بس یہاں وہاں سے بھٹکتی ہوئی کچھ شعاعیں در آتی تھیں۔ ایک بڑا سا کمرہ بھی تھا جہاں دوپہر کو کم اور رات کو لالٹین کی روشنی میں زیادہ نظر آتا تھا۔ ٹین کا چھوٹا سا مخروطی شکل کا مٹی کے تیل کا دیا ہوتا تھا جس کی بتی سے کئی برسوں سے مسلسل اٹھنے والا دھواں کمرے کی چھت کے برگوں اور دیواروں پر جم کر کلوں (جما ہوا دھواں) بن چکا تھا۔ ایک جانب لکڑی کے دوستونوں کے بیچ باندھی گئی رسی کی بلگنی پر لحاف اور کمبل تہہ کر کے لٹکائے گئے ہوتے جنھیں استعمال کے لئے سردیوں میں اتارا جاتا۔ کمرے میں کچھ جگہوں پر تند واریں بھی لگی ہوئی تھیں۔ بارش میں مٹی کی چھت جگہ جگہ سے ٹپکتی رہتی۔ بھتاروں (مٹی سے بنی ہوئی دیواریں) پر جگہ جگہ لگائی گئی ٹانڈوں پر گھر کا سامان رکھا رہتا تھا۔ برسات کے موسم میں چھت پر چھوٹے چھوٹے گول پتوں والا کُلفا ساگ اُگ آتا تھا جسے توڑ کر ہم پکاتے تھے۔

میرے نانا پونچھ میں چھاترا علاقے کے سینکڑوں کنال کھیتوں کھلیانوں کے مالک ایسے متمول زمیندار اور باشعور ذیلدار تھے کہ انھوں نے میری ماں کو اس زمانے میں آٹھویں تک پڑھایا تھا، اور آج میں دیکھ رہا تھا کہ میری نانی جو مسلسل دھوئیں میں دمے کی مریضہ ہو چکی تھیں، اس مکان کے برانڈے میں کھاٹ کو دیوار کے ساتھ لگا کر اور دائن میں بانس کی پتلی پتلی تیلیاں پھنسا کر پھُندنے والے ریشمی ازار بند بن رہی ہیں، جنہیں بازار میں بیچا جاتا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ میر پور کے رفیوجی بھی یہی کچھ کرتے تھے۔ وہ آٹے کی بوری لے آتے اور بازار سے بھی کم بھاؤ پر شام تک بوری کا آٹا فروخت کر دیتے اور شام کو خالی بوری کو منافع سمجھ کر

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

گھر لے جاتے تھے۔

وقت بھی کیسے کیسے تاریخی مذاق کر دیتا ہے لوگوں کے ساتھ۔ آج تو رفیوجیوں کیلئے اقوام متحدہ نے کیا کیا نہیں دے رکھا ہے مگر 1947 کے ہم رفیوجیوں کو رفیوجیوں کا درجہ نہ دے کر کوئی کمتر سا جانور سمجھ لیا گیا اور انتہائی بے رحمی سے تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا گیا۔

1957 میں جب میں آٹھ سال کا تھا تو میرے والد بخشی کرپا رام کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے چار دنوں کے بعد، پھر ایک مہینے کے بعد، پھر چھ مہینے کے بعد، پھر ایک سال کے بعد، پھر چار سال کے بعد موت سے جڑی ہوئی رسمیں نبھائی جاتی رہیں۔ یہ رسوم قریب ہی مقدس دیوک ندی کے کنارے پر ادا کی جاتی تھیں۔ پھر میرے نانا کا انتقال ہو گیا، پھر نانی کا، اور اس طرح اسی صحن میں موت سے جڑی رسموں کا ایک سلسلہ چلتا ہی رہا جن میں کئی کئی دنوں تک اور کئی کئی مخصوص دنوں پر بلا لہسن پیاز کی دال سبزی، پوڑی اور کھیر کا پروسا جانا مجھے یاد ہے۔ (بلا لہسن پیاز کی دال سبزی اور پوڑی، کھیر سے مجھے آج بھی وحشت ہوتی ہے)۔

ہم گھر میں پہاڑی (پوٹھوہاری کی ایک بولی) میں بات کرتے تھے۔ گھر کی اس محفوظ دنیا سے باہر نکلنے کا واحد راستہ گھر کی ڈیوڑھی تھا۔ ڈیوڑھی سے باہر نکل کر جب میں اسکول جانے لگا تو وہاں اس خطے کی زبان ڈوگری کو سنا۔ لیکن اسکول میں ہندی اور اردو دونوں رائج تھیں، دونوں پڑھائی جاتی تھیں۔ میری والدہ رام پیاری شرما نے مجھے اردو پڑھانے کا فیصلہ کیا اور اس طرح میری تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا۔

میری والدہ جواں عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ وہ ہر وقت اس غم میں آزردہ رہتی تھیں۔ میرا بھائی اشوک مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ والدہ اکثر ہمیں اپنی گود میں لے کر میرے والد کو یاد کرتیں اور روتی رہتی تھیں۔ محاصرہ پونچھ سے بذریعہ طیارہ انخلا کے وقت میرے والد پونچھ میں پولیس سب انسپکٹر کے طور پر تعینات تھے۔ والدہ میرے والد کی پولیس یونیفارم، گھوڑسواری کی برجیس، ان کے رینک کے ستارے، شانہ رسن، بیلٹ، کراس بیلٹ، پولیس کیپ اور اس قسم کے دوسرے Memorablia ہم دونوں بھائیوں کو دکھاتی اور روتی رہتی۔ یہ ایک بہت دلدوز منظر ہوتا تھا جسے دیکھ کر میں بھی رونے لگتا تھا اور میرا بھائی بھی۔ انھیں چیزوں میں میرے والد صاحب کی ایک ڈائری بھی تھی۔

جب میری عمر چالیس سے بھی تجاوز کر گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ سرزمین پونچھ کا یہ خاصہ ہے کہ وہاں کا ہر تیسرا شخص شاعر ہو یا نہ ہو، تخلص ضرور رکھتا ہے۔ چنانچہ آپ کو وہاں (کم سے کم اس دور میں) کئی اس قسم کے لوگ مل جاتے تھے جن کے نام موہن لال زخمی یا سریندر سنگھ باغی یا کچھ بھی ہوتا اور اس کے ساتھ تخلص کا لاحقہ ضرور ہوتا۔ اگر آپ پوچھیں کہ بھائی آپ نے زخمی تخلص کیا ہے تو کیا آپ شاعر ہیں؟ تو جواب ملے گا کہ لو جی، شاعری اپنی جگہ ہے تخلص اپنی جگہ۔ شاعری کا تخلص سے کیا تعلق؟ (ایسا مجھے بتایا گیا ہے)۔ بہر حال اس سارے خطہ پیر پانچال کا یہ وصف ہے کہ یہاں کی دو بڑی ادبی شخصیتوں، کرشن چندر اور چراغ حسن حسرت کی وجہ سے یہاں کے عوام وخواص کا مزاج اور ذوق آج بھی واضح طور پر ادبی ہو گیا ہے۔

میرے والد شاعر تو نہیں تھے لیکن اس ڈائری میں انھوں نے اس زمانے کے مشہور فلمی گانے یا کچھ مشہور اشعار وغیرہ لکھ رکھے تھے جنھیں میری والدہ مجھے اکثر سنایا کرتی تھیں۔ کچھ طبیعت میں بھی موزونیت رہی ہوگی کہ اس طرف میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ 1947 کے پناہ گزینوں کو حکومت نے کبھی کچھ نہیں دیا۔ والد کی وفات کے بعد سارا خاندان ہی بے سہارا ہو گیا۔ نہ کوئی زمین، نہ نقدی نہ کچھ۔ شکر تو یہ ہے کہ اس دور میں میری والدہ آٹھویں پاس تھیں اور اردو، ہندی، گورمکھی کو بخوبی پڑھ لکھ سکتی تھیں۔ ان کی اس اہلیت پر انھیں یہاں کے گوردوارے میں استانی کا کام ملا اور روکھا سوکھا گزارہ ہونے لگا۔ پھر کئی سال بعد انھیں ٹیچر کی سرکاری نوکری مل گئی۔ ساتویں آٹھویں جماعت میں اسکول کی لائبریری میں ناول دیکھے تو ماں سے پوچھا کہ آپ کے اسکول میں بھی تو ناول ہوں گے، لا دیجیے۔ چنانچہ ماں اسکول سے ناول لانے لگیں۔ گئودان، میدان عمل، چوگان ہستی، بازارِ حسن، کرشن چندر، منٹو، عادل رشید اور جانے کیا کیا اسی عمر میں پڑھ لیے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ گھر کے اندر ایک بالکل الگ لسانی ماحول تھا، گھر کے باہر ایک یکسر الگ لسانی فضا اور ان دونوں میں کوئی مماثلت یا ہم آہنگی نہیں تھی۔ دونوں کا لہجہ الگ، لفظیات الگ۔ میں بہ یک وقت دونوں لسانی منطقوں میں جی رہا تھا۔ پھر اردو کتابوں کا ایسا ماحول ملا کہ چھٹی جماعت تک پہنچتے پہنچتے میں اردو میں تک بندی کرنے لگا اور

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

لاشعوری طور پر اردو میرے اظہار کی اختیاری زبان بنتی گئی۔

ماں نے دیکھا کہ بیٹا تو ہر وقت ناولوں میں ڈوبا رہتا ہے تو انھوں نے اسکول سے کتابیں لانا بند کر دیں۔ ان دنوں یہاں ادھم پور کے بازار میں کئی دکانوں پر چھوٹے چھوٹے بورڈ لگے تھے کہ 'یہاں پر ناول کرائے پر ملتے ہیں'۔ دو روپے کی سکیورٹی تھی اور ایک آنہ کرایہ۔ ان دکانوں پر ابن صفی کی جاسوسی دنیا سے متعارف ہوا۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے سرّی ادبی ترجموں کے بعد آج تک ابن صفی کے سحر میں گرفتار ہوں۔ ماں نے دیکھا تو انھوں نے ادھم پور کے چھوٹے سے قصبے میں کرائے پر ناول دینے والے تمام دکانداروں کو مجھے ناول دینے سے منع کر دیا۔ میں گھر میں آ کر بہت رویا گڑگڑایا مگر ماں ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ یہ شاید 1964-65 یا تھوڑا آگے کا زمانہ تھا۔

میں ان دنوں نویں یا دسویں میں بوائز ہائر سیکنڈری اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہمارے اسکول میں سائنس بلاک کے ساتھ ڈسٹرکٹ لائبریری تھی۔ میں اس لائبریری میں گیا اور پوچھا کہ مجھے کتابیں کیسے مل سکتی ہیں۔ لائبریرین تھوڑو رام نے بتایا کہ اس کے لئے مجھے بیس روپے کی سکیورٹی جمع کروانی پڑے گی۔ میرے بیک گراؤنڈ والے کسی طالب علم کے لئے 1964-65 میں بیس روپئے بہت بڑی رقم تھی۔ بہر حال میں نے جیب خرچ میں سے بچا بچا کر خفیہ طور پر چھ سات مہینوں میں بیس روپے جمع کر لئے اور لائبریرین تھوڑو رام کو لائبریری کی سکیورٹی دے کر ممبر بن گیا۔ میں آج تک اس لائبریری کا ممبر ہوں۔

ماں بگڑتی رہتی تھیں اور میں اسکول کی کتابوں میں چھپا کر ناول پڑھتا رہتا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ میں گیارہویں میں فیل ہو گیا۔ اگلے سال پاس ہو کر 1967 میں ادھم پور ڈگری کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں اچانک ہم تین چار لوگوں نے ایک دوسرے کو دریافت کر لیا۔ یہ تھے کلدیپ گپتا صابر، سریندر ساجد، آنند سروپ انجم اور میں۔ کلدیپ صابر اچھے افسانے لکھتے تھے اور ان کے افسانوں پر پریم چند کی چھاپ ہوتی تھی۔ سریندر ساجد فیض کے رنگ میں شاعری کرتے تھے۔ صابر اور ساجد اب حیات نہیں ہیں۔ آنند سروپ انجم تین مجموعہ ہائے کلام شائع کر چکے ہیں اور اب خواہی نخواہی ایک آدھ شعر کہہ لیتے ہیں۔ کالج کے ایام کے دوران ہی جموں کے ادبی لوگوں سے نہ جانے کیسے رابطہ ہو گیا۔ ایک دن جموں سے میکش کاشمیری، پروفیسر منظر اعظمی، عابد مناوری، نور الزماں صدیقی نور، اوپی شرما سارتھی، مدن موہن غافل سنکشبری نے یہاں وارد ہو کر انجمن ادب کی تشکیل کی۔ مجھے صدر بنایا اور آنند سروپ انجم کو سیکریٹری۔

جموں کی انجمن ادب والوں نے میرا اولین افسانہ ''مشین کا پرزہ''، جموں کے کسی مقامی اخبار میں شائع کروا دیا تھا۔ پھر 1969 میں میرا افسانہ 'چاندنی کا دھواں' شاعر ممبئی میں شائع ہوا۔ ان دنوں اعجاز حسین صدیقی مرحوم اس کے مدیر تھے۔ شاعر ممبئی میں میرے کئی افسانے شائع ہوئے جیسے: ہم سفر، سورج کا اغوا اور کئی دوسرے۔

ظاہر ہے 1969 میں بی۔ ایس۔ سی کے امتحان میں مجھے ناکام ہونا ہی تھا۔ پتہ ہی نہ چلا کہ اگلے دو برسوں میں کہاں کہاں اور کیسی آوارگی ہوتی رہی۔ 1972 میں بی۔ ایس۔ سی پاس کر کے جموں یونیورسٹی کے شعبہ قانون میں داخلہ لیا۔ اسی دوران کہیں آنند لہر، فاروق مضطر اور شب خون سے ملاقات ہو گئی۔ شب خون میں خوب اشاعتیں ہوتی رہیں۔ ان ہی دنوں جموں کے ایک سردار جی نے شمس الرحمٰن فاروقی کی فرزندی حاصل کر لی اور آئندہ کے لئے شب خون میں میرا اور آنند لہر کا شائع ہونا منقطع ہو گیا۔

کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے دو سال کے بعد قانون کی پڑھائی بھی چھوٹ گئی۔ کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ جانا کہاں ہے، کرنا کیا ہے۔

1972 میں بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری بہت بڑی بات تھی۔ لیکن 'یہ تو 1947 کا رفیوجی ہے' والے Tag کے ساتھ سسٹم میں کہیں کوئی داخلی دروازہ کھلا نہیں ملا۔ اپنی بے بضاعتی اور نظامیہ کی دانستہ بے حسی سے زبان کا ذائقہ تلخ ہو گیا اور طبیعت پر ایک لازوال افسردگی طاری ہوتی گئی۔ افسردگی کی یہ پرتیں اتنی دبیز ہیں کہ ان میں دفن Fossils کی شناخت کر پانا بھی اب مشکل ہے۔ میری شاعری یا میری فکشن نگاری انہی احساسات کے دبے دبے سے، سہمے سہمے سے اظہار کی معدوم سی کوشش ہے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ 'ایک بوند زندگی' شائع کر چکا ہوں۔ چار مزید کتابیں مکمل ہونے کے باوجود کئی سال سے طباعت کے مختلف مراحل میں ہیں۔

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

حادثہ

■ بلراج بخشی

نذیر اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ونڈ اسکرین کے پار خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ ہاتھ اسٹیئرنگ وھیل پر تھے اور انگلیاں طویل وقفوں سے وھیل کو تھپتھپا کر اس کے اندر کی بے چینی کو مترشح کر رہی تھیں۔

کسی آواز پر چونک کر اس نے عقبی شیشے میں دیکھا۔

اب اسے بس اسٹینڈ سے نکلنا ہی پڑے گا کیونکہ ہر دس منٹوں کے بعد دوسری گاڑی آجاتی ہے۔ اس وقت بھی دوسری گاڑی پیچھے آگئی تھی اور مسلسل ہارن دے کر اس سے بس اسٹینڈ سے نکل جانے کا تکرار کر رہی تھی۔ اس نے گاڑی کے اندر کا جائزہ لیا۔ تقریباً آدھی بس خالی تھی پر اس نے اِگنیشن میں کنجی گھمائی اور اسٹینڈ سے نکل کر گاڑی کسی سست رو کچھوے کی رفتار سے رینگنے لگی۔ حالانکہ معمولی رفتار سے چلتے ہوئے بھی گاڑی تین یا چار منٹوں میں ٹریفک زدہ جموں شہر کی حدود سے باہر نکل سکتی ہے لیکن مزید سواریوں کے انتظار میں سبھی گاڑیاں رینگتی رفتار میں کم سے کم پندرہ بیس منٹ لگا دیتی ہیں اور دھوپ میں تنور کی طرح تپی ہوئی بس کے اندر بیٹھے مسافروں کے پاس چہرے پر بہتا پسینہ پونچھنے اور ڈرائیور کو کوسنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔

'چلو بھائی... اس گرمی میں ہمیں فرائی کرو گے کیا...' کسی نے اونچی آواز میں کہا اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

یہ وہی روز آنے جانے والا باتونی مسافر تھا جو صبح آٹھ بجے اُدہم پور سے آتا تھا اور شام چار بجے واپس جاتا تھا۔ اس کا وصف یہ تھا کہ وہ جس گاڑی میں بھی سفر کرتا نہ صرف اس کے ڈرائیور اور کنڈکٹر اس سے پناہ مانگتے بلکہ باقی سواریاں بھی پریشان ہوتی تھیں۔ اسے بیٹھے دیکھ کر کئی سواریاں گاڑی سے اتر ہی جاتی تھیں کہ دس منٹ بعد اگلی گاڑی سے چلیں گے۔ جموں سے ادہم پور کے دو گھنٹوں کے اس سفر میں وہ مسلسل بولتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی بلند آواز میں بے تکان بولے جا رہا تھا:

'اس ملک کا کچھ نہیں ہو سکتا... نہ ٹرین وقت پر چلتی ہے نہ گاڑی... ارے بھائی... وقت سے پہلے نہیں تو کبھی کبھار وقت پر ہی چل کر دکھاؤ... مگر نہیں... ہمیشہ لیٹ چلیں گے... لیکن سالے لیٹ پیدا نہیں ہوتے... نو مہینے پورے ہوئے نہیں کہ کھٹاک سے آگئے... اور پھر خود پیدا کرنے میں جُٹ جاتے ہیں... ساری دنیا خواہ مخواہ اس بحث میں لگی ہے کہ بھگوان ہے یا نہیں... میں کہتا ہوں اگر یہ ملک چل رہا ہے تو اس کا مطلب ہے بھگوان ہے... ورنہ کون چلا رہا ہے اس ملک کو؟ کیوں جی؟' اس نے ساتھ والے کو ٹہوکا دیا اور اس نے ہنکارا ابھرا۔

'اب اس ڈرائیور کو ہی دیکھ لو... بھئی اگر سواری نہیں ہے تو کیا کرو گے؟... گھر پر بلانے جاؤ گے؟... ذرا گاڑی کی اسپیڈ تو دیکھو ... ایسا لگتا ہے جیسے یہاں سے جانے کو اس کا من ہی نہیں کر رہا ہے...'

نذیر نے سنا اور اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ آج جتنی بکواس کر سکتا ہے کر لے بیٹا، کیونکہ آج کے بعد تُو بول ہی نہیں پائے گا... لیکن میں یہاں کر کیا رہا ہوں، اس نے حیرت سے سوچا۔ آج مجھے سواریوں کے انتظار کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس نے گیئر بدلا اور گاڑی ٹریفک کے اژدہام میں اپنا راستہ بنانے لگی۔ اس مقام پر گاڑی کی خلاف معمول بڑھتی رفتار دیکھ کر کنڈکٹر نے حیرت سے ڈرائیور کی جانب دیکھ کر سیٹی بجائی اور گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی حسب عادت نذیر کا پاؤں بریک پر پڑا اور گاڑی بائیں جانب ہو کر آہستہ سے رک گئی۔ نذیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

'سواریاں ہیں...' کنڈکٹر نے جلدی سے کہا اور نیچے اتر کر مسافروں کو بس میں چڑھانے لگا۔

نذیر نے برا سا منہ بنایا اور عقبی شیشے میں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کو دیکھنے لگا۔ ایک بوڑھا آدمی کھانس رہا تھا اور اس کے ساتھ شاید اس کا جوان بیٹا تھا جو اسے سنبھالے ہوئے تشویشناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

'اب اور زندہ رہ کر کیا کرو گے بابا... کسی اور کے حصے کی روٹیاں توڑو گے؟... وقت نکال کر مر بھی جاؤ کسی دن...' نذیر نے سوچا اور نظر دوڑائی۔ ایک نوعروس جوڑا آس پاس سے بے خبر راز و نیاز میں مگن تھا۔ '...جی بھر کے باتیں کر لو... ابھی دن ہیں... چار پانچ سالوں میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا... مگر تمہاری

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

مصیبتوں کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے... فکر نہ کرو...'

سب سے آخیر میں ایک عورت دو تین سال کا بچہ اٹھائے ہوئے بس کے اندر آئی اور بیٹھنے کے لیے ادھر ادھر دیکھ کر سیٹ تلاش کرنے لگی۔ بچے کو دیکھ کر نذیر کی آنکھیں اور ہونٹ افسوس کے انداز میں سکڑ گئے کہ جیسے کوئی اندوہناک واقع ہو گیا ہو۔ کنڈکٹر اندر آ گیا اور چلنے کے لیے دو سیٹیاں بجائیں۔ نذیر نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور رفتار تیز کر دی۔ کنڈکٹر نے پھر حیرت سے ڈرائیور کو دیکھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ گاڑی آدھی سے زیادہ بھر چکی تھی لیکن اگر رفتار دھیمی کر دی جائے، جیسا کہ روز کا معمول تھا، تو شہر سے نکلتے نکلتے باقی سیٹیں بھی بھر ہی جاتی ہیں۔ آج استاد کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگتی یا شاید جلدی میں ہے، کنڈکٹر نے سوچا اور پھر سیٹی بجا دی۔ حالانکہ نذیر نے اب گاڑی نہ روکنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن سیٹی کی آواز سنتے ہی اس نے عادتاً بریک لگا دی، اسٹیئرنگ بائیں جانب گھما کر شکنتلا تھیئٹر کے پاس گاڑی روکی اور مڑ کر استفہامیہ نظروں سے کنڈکٹر کو دیکھا کیونکہ یہاں سڑک کے دونوں اطراف میں کوئی سواری بھی نظر نہیں آئی۔

'بازاری سامان ہے...' کنڈکٹر نے اونچی آواز میں کہا اور نیچے اتر گیا۔ سڑک کے کنارے بازاری سامان کی پیٹیاں اور بڑے بڑے ڈبے رکھے ہوئے تھے جنہیں قلی بس کی چھت پر چڑھانے لگے۔ نذیر نے بے چینی سے عقبی شیشے میں دیکھا۔ اس کی نظر بچے پر پڑی جو بار بار ہنس رہا تھا۔ اس وقت اسے کے دل میں ہمدردی اور رحم کے جذبات نہیں آنے چاہییں، اس نے اپنا رویہ بدلتے ہوئے ظالمانہ انداز میں سوچا کہ اسے کسی قسم کے احساسِ جرم سے بچنا چاہیے ورنہ وہ یہ کام کیسے انجام دے سکے گا۔ روؤ گے بیٹا... اس نے بچے کو پھر دیکھ کر اپنا رویہ دانستہ کڑا کیا... یہ تو کچھ بھی نہیں، ایک دن ایسا رونا شروع کرو گے کہ زندگی بھر روتے ہی رہو گے... میرا شکر یہ ادا کرو کہ میں تمہیں وہ دن نہیں دیکھنے دوں گا۔

'اب دیکھو ... یہ سالے راستے میں کچھ بھی نہیں چھوڑتے... یہ تو خیر بازاری سامان ہے، کئی بار بکریاں بھی بس میں لے جاتے ہیں ... لیکن پھر بھی ان کے ہاتھ خالی کے خالی ... بھکاریوں کی طرح پھیلے ہی رہتے ہیں...' حالانکہ روزانہ کے مسافر نے یہ جملہ اپنی طرف سے دھیمی آواز میں کہا لیکن اصل میں اس کی آواز ہی فطری طور پر اتنی بلند تھی کہ ڈرائیور کو سنائی دے گئی۔

تمہارا تو میں خاص خیال رکھوں گا سالے... اس حساب سے ایکسیڈنٹ کروں گا کہ تمہارا بچنا ناممکن ہی ہوگا، نذیر نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔

کنڈکٹر نے سیٹی بجائی اور نذیر نے گاڑی آگے بڑھا کر اب مزید نہ روکنے کا آخری بار فیصلہ کر لیا۔ پھر کنڈکٹر نے کئی مقامات پر سیٹی بجا کر گاڑی رکوانے کی کوشش بھی کی لیکن اسے نظر انداز کر کے نذیر دو تین ہی منٹوں میں گاڑی شہر باہر سے نکال لے گیا۔ کنڈکٹر ڈرائیونگ کیبن میں آیا۔

'آج کیا بات ہے استاد جی... بہت جلدی ہے؟'

'ہاں... آج بہت جلدی ہے...'

'خیریت ہے نا...'

'آج کے بعد سب خیریت ہی خیریت ہے... نذیر نے اس پر ایک اچٹتی سی معنی خیز نظر ڈال کر سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

کنڈکٹر کچھ دیر اسے الجھن بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر شانے اچکا کر کیبن سے باہر آ گیا اور مسافروں سے کرایہ وصول کرنے میں لگ گیا۔

نذیر کی نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھیں اور گاڑی کی رفتار معمول سے کچھ زیادہ تھی۔ لیکن وہ حیرت انگیز طور پر پُرسکون تھا اور اس کے ذہن پر بھی کوئی بوجھ نہیں تھا۔

اس نے عقبی شیشے پر نظر ڈالی۔ لوگ اونگھنے لگے تھے۔ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا اور سب ختم ہو چکے ہوں گے، اس نے سوچا اور اسے حیرت ہوئی کہ آج وہ کتنی آسانی سے اپنی اور ان سب کی اجتماعی موتوں کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

لیکن اب میرے پاس کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے، اس نے سوچا۔

پچھلے دو مہینوں سے وہ اس الجھن میں تھا کہ پندرہ لاکھ روپیہ کہاں سے آئے گا۔ بیٹے کو کسی پیشہ ورانہ تربیتی کورس کے لیے بھیجنا تھا۔ لڑکی شادی کے بجائے مزید پڑھائی پر مصر تھی۔ کل ملا کر پندرہ بیس لاکھ اٹھ جانے تھے۔ اس نے بینک سے بھی اعلیٰ تعلیمی قرض لینے کی کوشش کی مگر اس کے لیے ضمانت دینا پڑتی ہے یا پھر جائیداد رہن رکھنا پڑتی ہے۔ بیس لاکھ کے لیے نہ تو اس کے پاس کوئی ضامن تھا اور ادہم پور کی نارسا پہاڑیوں کے بیچ اس کی پشتینی زمین بمشکل لاکھ دو لاکھ کی رہی ہوگی۔ پھر اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا؟ آج وہ گاڑی کے مالک کے پاس گیا تھا کہ شاید وہ ہی

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

کوئی حل بتائے۔ لیکن مالک نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے اس کی انشورنس پالیسی کا ذکر کیا جس پر وہ کمپنی سے قرض لے سکتا تھا۔

'لاکھ دو لاکھ کی بات ہو تو میں دے سکتا ہوں...مگر بیس لاکھ!...ایسا کرو...تمہارا تو انشورنس بھی کروایا تھا میں نے...اب تو کئی سال ہو گئے ہیں...اسی پر قرض کیوں نہیں لے لیتے؟'

بیس لاکھ کا انشورنس بھی مالک ہی نے کروایا تھا۔ مالک نے ایجنٹ کو فون کیا تو اس نے بتایا کہ اس مرحلے پر چھ سات لاکھ سے زیادہ قرض نہیں مل سکتا۔ نذیر مالک کے گھر سے نکلا تو اسے زیادہ مایوسی نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی اسے پندرہ لاکھ روپیہ کیوں دے گا۔ وہ تو اپنی پریشانی میں مالک کو بھی شامل کر کے محض اپنا من ہلکا کرنے کے لیے آیا تھا کہ شاید کوئی حل نکل آئے اور واقعی حل نکل آیا۔ انشورنس کی بات چھڑتے ہی اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر سڑک حادثے میں وہ مر جائے تو انشورنس کا بیس لاکھ تو گھر والوں کو یقیناً مل جائے گا اور اب تو نئے قانون کے مطابق حکومت کی طرف سے بھی سڑک حادثوں میں مرنے والوں کو پانچ لاکھ روپیہ ملنا طے ہو چکا تھا۔ نذیر کا شمار اچھے ڈرائیوروں میں ہوتا تھا اور اسی لیے آج تک اس سے کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن حادثہ کیا تو جا سکتا ہے نا۔ نذیر نے سوچا اور مسئلے کے اس آسان سے حل پر مطمئن ہو گیا۔

پینتالیس سال کی عمر میں جو دیکھنا تھا میں نے دیکھ لیا ہے اور جو کر سکتا تھا کر لیا ہے۔ نجی گاڑیوں کا ڈرائیور بچوں کو معمولی کھانا اور عام سطح کی پڑھائی کے علاوہ اور کیا دے سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب میں اس سے زیادہ گھر والوں کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ ٹیلیوژن کے اس دور میں جبکہ گاؤں گاؤں میں بچے تعلیم کے بارے میں زیادہ حساس تو ہوتے جا رہے تھے لیکن اعلیٰ تعلیم ہر کسی کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ اور سب سے بڑی توہین آمیز بات تو یہ ہے کہ عمر بھر بچے اسے کچوکے دیتے رہیں گے کہ اگر ہمارے باپ نے اس وقت کچھ کیا ہوتا تو آج ہم بھی کچھ اور ہی ہوتے...یہ سوچے بغیر کہ ان کا باپ کر ہی کیا سکتا تھا...یہی ٹھیک رہے گا...گھر والوں کو بیس پچیس لاکھ مل جائے گا تو اس کے بچے کم سے کم اپنے خوابوں کو حاصل کرنے کی کوشش تو کر سکیں گے...وہ سوچتا رہا اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ دیر کرنے یا ٹالنے کا کوئی فائدہ نہیں، یہ کام کھڑے گھاٹ ہی نمٹ جائے تو بہتر ہے۔ اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ کام اسے آج ہی سرانجام دے دینا چاہیے۔

گاڑی تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ بس...اب زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ باقی ہیں، نذیر نے سوچا۔ بنیادی طور پر وہ ایک اوسط درجے کا بے ضرر قسم کا انسان تھا۔ آج تک اس کے ہاتھوں دانستہ یا نادانستہ طور پر کسی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ مگر یہ خودکش فیصلہ لیتے وقت اس کے ذہن میں ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا کہ اس کے ساتھ اور کتنی زندگیاں ختم ہو جائیں گی جنہیں اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے اور جو اس کی پریشانیوں کے ذمہ دار بھی نہیں ہیں۔ لمحوں میں لے لیے گئے اس مہلک فیصلے پر اسے ذرہ برابر بھی افسوس یا پچھتاوا نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے رفتار بڑھائی اور بس سامنے سے آتی ہوئی ایک گاڑی کے اتنے قریب سے تقریباً اسے اس طرح چھوتے ہوئے گزری کہ سواریاں بے اختیار چیخ پڑیں اور اونگھتے ہوئے مسافر بھی چیخ و پکار سے ہوش میں آ گئے۔ نذیر نے یہ خوفزدہ چیخیں سنیں لیکن اس کا چہرہ جذبات سے عاری رہا۔ گاڑی بدستور اسی جان لیوا تیز رفتاری سے چلتی رہی۔

جموں سے ادہم پور جانے والی سڑک گھماؤ دار شوالک پہاڑی سلسلے سے گزرتی ہے جس پر لاتعداد تاریک موڑ ہیں۔ گاڑی رفتار پکڑ ہی نہیں پاتی کہ تیکھا موڑ آ جاتا ہے اس لیے گاڑی تیس کلو میٹر فی گھنٹہ کی اوسط رفتار سے زیادہ دوڑ ہی نہیں پاتی۔

'یہ پاگل تو نہیں ہو گیا؟' خوفزدہ سواریوں نے چلا کر کنڈکٹر سے پوچھا۔

کنڈکٹر بھی ڈرائیونگ کیبن کی طرف حیرت سے دیکھ کر سوچنے لگا کہ اس لاپرواہ اور عاقبت نااندیشانہ تیز رفتاری سے تو استاد کبھی گاڑی چلاتا ہی نہیں، آج پتہ نہیں کیا بات ہے۔ وہ ہچکولے کھاتی ہوئی بس میں لڑکھڑاتے ہوئے ڈرائیونگ کیبن کی جانب بڑھا اور دو تین لوگ بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔ نباتونی مسافر بھی ان میں شامل تھا۔

'کیا کر رہے ہو استاد جی؟ کنڈکٹر نے بدقت تمام کہا اور نذیر کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ رینگنے لگی۔

کنڈکٹر نے دیکھا کہ نذیر کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ وہیل پر جمے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، سکڑی ہوئی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک تھی اور نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر کنڈکٹر پر ہیبت طاری ہونے لگی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پر آواز نہ نکل سکی۔ سواریوں نے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

ایک بار پھر گاڑی کی بڑھتی ہوئی رفتار کو واضح طور پر محسوس کیا اور سب چلانے لگ پڑے۔

’کیا بات ہے بھائی ...مرنے کا ارادہ ہے کیا؟‘ باتونی آدمی غصیلی آواز میں چلایا۔

مگر نذیر نے کوئی جواب نہیں دیا، اس نے شاید سنا ہی نہیں۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری ہونے لگا جیسے اس کا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا ہو۔ وہ موڑ آنے ہی والا ہے جہاں سے اس نے گاڑی کو ڈھائی سوفٹ گہری کھائی میں گرا دینے کا سوچ رکھا تھا۔

رفتار اب خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی اور سڑک پر کئی جگہوں پر گڈھوں پر سے گاڑی اچھلتے ہوئے جا رہی تھی۔ سواریاں بھی نشستوں پر اچھل اچھل کر چیخنے چلانے لگ گئیں اور بچے رونے لگے۔

’ارے پاگل ہو گیا ہے حرامزادے...‘ کیبن کے اندر ایک مسافر نے چیخ کر گندی سی گالی نکالتے ہوئے کہا۔

باقیوں نے بھی کچھ کہنا چاہا لیکن ڈر کے مارے حلق سے آواز ہی نہیں نکلی۔ کنڈکٹر کے ہونٹ خشک تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں میں خوف لیے سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ آگے تیکھے زاویے والا موڑ تھا اور اس رفتار سے تو گاڑی اس موڑ پر سے گزر ہی نہیں سکتی تھی۔ دوسری طرف گہری کھائی تھی۔ کنڈکٹر نے چلانے کی کوشش کی مگر سوکھے حلق سے نکلنے والی آواز کسی زکام زدہ مینڈک کی سرگوشی سے مشابہ تھی:

’استاد؟‘

لیکن نذیر کے کانوں تک کوئی آواز پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ بس اور کچھ سیکنڈ، اس نے سوچا، اور وہ زندگی کی تمام پریشانیوں سے نہ صرف دور چلا جائے گا بلکہ اپنے گھر والوں کے تئیں بھی اپنا فرض نبھا جائے گا۔ موڑ سامنے آ گیا۔ اس کی گردن آگے جھک گئی۔ بس یہیں .... ہاں یہیں ... ایکسلریٹر پر تھوڑا سا مزید دباؤ... اور بس... گاڑی ڈھائی سوفٹ نیچے۔

اس کے دائیں پاؤں کے عضلات سکڑ کر ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھانے لگے۔

اچانک اسے بائیں جانب والے ڈھلواں چٹانی سلسلے کے ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے ایک جنگلی خرگوش نظر آیا جو سرعت سے سر کو گھما کر سڑک کے دونوں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ خرگوش نے گاڑی کو دیکھ لیا ہے، اب وہ سڑک پار نہیں کرے گا، اس نے سوچا۔ دراصل سڑک کے کناروں سے ملحقہ نواح میں رہنے والے جانور پیدائش ہی سے گاڑیوں کی آمد و رفت کے عادی ہو کر جینا سیکھ لیتے ہیں اور ان کے غیر شعوری افعال بھی اسی کی مطابقت سے حساس ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس خرگوش نے آج تک اس مقام پر کسی گاڑی کو اس رفتار سے چلتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے تجربے کے مطابق اس جگہ گاڑی کی رفتار پُرخطر نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس گاڑی کی رفتار معمول سے تیز تھی۔ خرگوش کو گاڑی کی رفتار کا اندازہ نہیں ہو سکا اور اس ارادے سے کہ گاڑی کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ سڑک پار کر لے گا اس نے چھلانگ لگا دی۔

یہ خطرناک صورت حال تھی۔ نذیر کو اندازہ ہو گیا کہ خرگوش کا کچلا جانا طے ہے۔ معاً اس کے ذہن میں ڈرائیونگ استاد بھوپندر سنگھ کی کہی ہوئی بات کوندے کی طرح لپکی:

’اوئے نذیرے... گاڑی چلاتے وقت ہمیشہ ایک بات کا دھیان رکھنا... آنکھیں اور ہوش... دونوں ... ہر وقت سڑک اور اس کے آس پاس پر... اگر ٹھان لی ہے... تو پیارے... گاڑی ملٹری کے ٹینک پر چڑھا دے... لیکن یارا... اندیکھی کر کے ... یا... لاپرواہی کی وجہ سے گاڑی کے نیچے کوئی جاندار... کبھی نہیں آنا چاہیے ...سنا؟... کبھی نہیں... انسان کی تو بات ہی کیا... چیونٹی بھی نہیں۔‘

اضطراری طور پر ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں نذیر کا دایاں پاؤں بریک اور بایاں کلچ پر جم گئے۔ یہ قطعی غیر ارادی فعل تھا اور اس کے ساتھ ہی کسی لاشعوری حکم کی تعمیل میں اس کے ہاتھوں نے تیزی سے اسٹیرنگ دائیں جانب گھما دیا۔ بہرہ کر دینے والی زوردار چرچراہٹ آمیز چیخوں کے ساتھ گاڑی کے پہیے سڑک پر نشان بناتے ہوئے دور تک گھسٹتے چلے گئے اور گاڑی سڑک کے کنارے حفاظتی پشتے سے جا ٹکرائی۔

زوردار دھماکہ ہوا اور گاڑی رکتے ہی ایک جھٹکے کے ساتھ ڈرائیونگ کیبن کا دروازہ کھل گیا۔ اور پھر کھلے دروازے سے باہر ہوا میں تیرتے ہوئے نذیر نے بریکوں کی چرچراہٹ کی آوازوں کے ساتھ ہی خرگوش کو سڑک کے درمیان سے واپس مڑ کر بائیں کنارے کے پتھر کی محفوظ اوٹ میں جاتے دیکھا۔

نذیر خاموشی سے دو ڈھائی سوفٹ گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔ گاڑی کے مسافر بے تحاشہ چیخ چیخ کر اسے گالیاں دینے کے ساتھ ساتھ روتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

زندہ آدمی

■ بلراج بخشی

'اسے بکرا بنا کر زمین پر واپس بھیج دو...' چتر گپت نے مور پنکھ کی قلم سے فائل پر کچھ لکھتے ہوئے ایک فرشتے کو حکم دیا۔

بکرا پہلے تو پلکیں جھپکائے بغیر چتر گپت کو دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے اس کی ٹھوڑی پر موجود چھدری داڑھی میں جذب ہونے لگے اور اب ہچکیاں لیتے ہوئے وہ مزید مضحکہ خیز لگنے لگا۔ چتر گپت نے اسے حیرت سے دیکھا۔

'کیا بات ہے؟' چتر گپت نے نرم لہجے میں استفسار کیا اور ان کے ہمدردانہ لہجے پر بکرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر جب بہت دیر بعد معمول پر آیا تو بولا:

'رحم کرو پربھو... اب اور برداشت نہیں ہوتا... کسی دوسری جون میں بھیج دو...'

'کیوں؟... بکرے کے جنم میں کیا خرابی ہے؟'

'کب تک انسان میرا گلا کاٹتا رہے گا؟' بکرا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور اگلے دونوں سم جوڑ کر فریاد کرنے لگا۔

'دیکھو...' چتر گپت نے اس کی فائل کا دوبارہ مطالعہ کر کے کہا' تم عوام کے طبقے میں ہو... اس لیے عوام بن کر جینا... یا ... مرنا سیکھو... قومی جھنڈے میں لپٹے بغیر... کبھی عوام کو اپنا گلا کٹوانے سے انکار کرتے ہوئے دیکھا ہے؟... نہیں نا... اے بکرے ... اس سنسار میں ہر جاندار کا مستقبل مقرر ہے... لیکن تمہارا... اور عوام کا مستقبل تو ہے ہی نہیں... پھر بھی... اگر تم عوام کی ہی جون میں جانا چاہتے ہو... تو ٹھیک ہے... مگر یاد رکھو... خسارے میں رہو گے... بکرا بنو گے... تو دو تین سال میں گلا کٹ ہی جائے گا... اور اگر عوام کی جُون ملی... تو گئے پچاس ساٹھ سال کے لیے... سُن رہے ہو؟... کم سے کم پچاس ساٹھ سال تک ایڑیاں رگڑتے رہو گے... بھوک سے... پیاس سے... ڈر سے... بیماری سے... سسکتے رہو گے ... مگر جان نہیں نکلے گی... نصیب اچھا ہوا تو... کسی ایکسیڈنٹ میں... جلدی بھی مر سکتے ہو... لیکن مجھے تمہارے نصیب کے بارے میں کچھ نہیں پتہ... نصیب دوسرے محکمے میں لکھا جاتا ہے... میرے پاس صرف کرموں کا... نیک و بد اعمال کا حساب کتاب ہے... لیکن ... پھر کہتا ہوں... یہ بھی تو دیکھو... بکرے کی جُون میں تمہیں کیا کیا سہولتیں... کیا کیا perks ملتے ہیں... جب تک تم زندہ ہو... تمہارا مالک خود بھوکا پیاسا رہ جائے گا... پر تمہیں بھوکا پیاسا نہیں رہنے دے گا...'

بکرا چتر گپت کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس نے یہ پہلے سوچا ہی نہیں تھا۔

'ہاں...' چتر گپت نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا' ... جو کچھ ہمارے پاس ہوتا ہے، ہمیں اس کی قدر نہیں ہوتی... اور جو نہیں ہوتا، اس کی تمنا میں روتے رہتے ہیں... تم نے شاید دھیان نہیں دیا... ارے تمہارا مالک... تمہارے لیے ہری پتیاں... اور پانی کا انتظام کرتا ہے کہ نہیں؟... خود کھلے میں سوتا ہے لیکن تمہارے لیے... ایک چھت... چاہے ٹپکتی ہوئی ہو... کا انتظام کرتا ہے یا نہیں؟... تمہارا مالک خود کو مچھروں سے کٹوا لے گا... مگر تمہارے لیے mosquito repellant ضرور لائے گا تا کہ تمہیں ڈینگو بخار نہ ہو جائے... تمہیں پتہ ہی نہیں کہ بکرا پیکیج میں... مفت کھانا... مفت رہائش کے علاوہ ... اور بہت کچھ ہے... شاید تمہیں کسی نے ورغلایا ہے... بکرے کی جُون آسانی سے نہیں ملتی... تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ تمہاری معصوم شکل دیکھ کر میں تم پر پہلے ہی کتنا مہربان ہوں... اس لیے... اے بکرے... جا... زمین پر واپس جا... اچھا بکرا بن... اور خوشی خوشی اپنا گلا کٹوا...'

'جو... حکم... بھگون...'۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اصل میں بکرے کو پہلے اس طرح کسی نے سمجھایا ہی نہیں تھا۔

سورگ میں بھی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں، بکرے کے جانے کے بعد چتر گپت نے طویل سانس لے کر سوچا اور سامنے نظر اٹھائی۔ دو فرشتے ایک انسان کو پکڑ کر لا رہے تھے۔ اس کی فائل ملاحظہ کرنے کے بعد چتر گپت بولے:

'... مارکیٹ میں لکڑی مہنگی مل رہی تھی... تم نے اسمگلنگ کی لکڑی سستے میں بیچ کر لوگوں کے مکان بنوانے میں مدد کی... بہت اچھے... اور چوری کا سیمنٹ بھی سستا بیچ کر دوسروں کی مدد کی... ویری گڈ... تمہیں دو سال کے لیے سورگ میں بھیجا جا رہا ہے... دو سال بعد پھر زمین پر واپس... اسے لے جاؤ...'

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

’صرف دو سال پربھو؟‘

’ارے ... یہ کوئی زمین کے سال تھوڑے ہی ہیں ... سورگ کے سال بہت طویل ہوتے ہیں ... جاؤ۔‘ چتر گپت نے ڈانٹا۔

دو فرشتے ایک طوطے کو پکڑ لائے اور فائل چتر گپت کے آگے رکھ دی۔

’ہوں ں ں ... ایں...‘ فائل دیکھ کر چتر گپت نے حیرت سے کہا‘ ٹھگ... جھوٹا... اور... اور چار سو بیس؟‘

’اس میں میرا کوئی دوش نہیں ... پربھو...‘ طوطے نے کانپتے ہوئے کہا‘ ... مجھے انسان نے مجبور کیا تھا...‘

’سبھی اپنی غلطیوں کے لیے دوسروں کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں... انسان نے مجبور کیا تھا؟... کیسے؟‘

’پربھو... اس نے میرے پر کاٹ دیے ... پھر مجھے بھوکا... پیاسا رکھ کر... چھڑی سے مارتا تھا... اور... سڑک کے کنارے بیٹھ کر جھوٹی قسمت بتانے والے کارڈ اٹھانے پر مجبور کرتا تھا... اس کا حکم ماننے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا... مائی باپ...‘

’میں یقین نہیں کر سکتا...‘ چتر گپت نے بے اعتباری سے کہا‘ ... یہ کیس پینڈنگ رکھو... اس میں مزید انکوائری کی ضرورت ہے...‘

ایک ہاتھی کو لایا گیا۔ چتر گپت کچھ دیر فائل میں کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر مطالعہ کرتے رہے، پھر ہاتھی کی طرف دیکھے بغیر بولے:

’اسے چوہا بنا کر زمین پر واپس بھیج دو...‘

’یہ انیائے ہے پربھو... گھور انیائے... بے انصافی ہے... ظلم ہے...‘ ہاتھی نے احتجاج کیا اور چتر گپت چونک گئے۔ پہلے بکرا، پھر طوطا اور اب یہ ہاتھی۔ آج تک ان کے فیصلے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہو رہی ہے، انہوں نے سوچا اور ہاتھی سے نرم لہجے میں کہا:

’کیا بات ہے؟... صاف صاف کہو...‘

’پربھو... میں نے اپنی زندگی میں کوئی برا کام نہیں کیا... اور... اور آپ مجھے چوہا بنا کر بھیج رہے ہیں؟... کم سے کم ہاتھی تو رہنے دیتے...‘

’میں کیا کروں... بتاؤ...‘ چتر گپت نے فائل کی طرف اشارہ کیا‘ ... یہ لکھا ہے... ہاتھی بن کر تم نے کون سے کارنامہ کیا؟... اتنی طاقت تمہیں دی گئی تھی... تم نے اس کا کیا استعمال کیا؟... وہ انسان... پانچ ساڑھے پانچ فٹ کا آدمی... جو تمہاری ایک ٹانگ کے برابر بھی نہیں ہے... تمہاری گردن پر بیٹھ کر سواری کرتا ہے... تمہیں نچاتا ہے اور تم ناچتے ہو... اس کے اشارے پہ فُٹ بال کھیلتے ہو... لوگوں کو سلام کرتے ہو ... اتنے بڑے جسم ... اور اتنی طاقت کا تم کیا کرو گے؟... چوہا ہی ٹھیک ہو...‘

’اس میں میرا کوئی دوش نہیں بھگوان... آدمی ایسا ہی ہوتا ہے... وہ جو کہتا ہے ہمیں کرنا پڑتا ہے... اس کی آ گیا ماننی پڑتی ہے پربھو...‘

’اپنی کمزوری ... کم عقلی... اور غفلت کا الزام... انسان کو دے رہے ہو... اتنے بڑے جسم کا مالک ہو کر؟... کیا تمہیں اپنی طاقت کا اندازہ نہیں؟‘

’انسان کے سامنے میری طاقت بے کار ہے پربھو ... میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا... ایک میں کیا... انسان کے سامنے... شیر، چیتا، بھالو، بندر... تمام جانور... تمام پرندے... بے بس ہیں... ہمیں تو بے گھر کر دیا ہے اس نے... ہم اس کا حکم ماننے پر مجبور ہیں بھگوان ... آپ نہیں جانتے... یہ پانچ ساڑھے پانچ فُٹ کا انسان بہت خطرناک ہے...‘

’خطرناک؟... اور... آدمی؟...‘ چتر گپت نے قہقہہ لگایا ’... آؤ... آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ آدمی کتنا خطرناک ہے...‘

چتر گپت ہاتھی کو ایک جانب لے گئے۔

’یہ دیکھو... ادھر دیکھو... اُدھر دیکھو... وہاں دیکھو... ہر طرف دیکھو...‘

ہاتھی نے دیکھا کہ چاروں طرف، جگہ جگہ انسان اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں اور ان کے پاس کھڑے دیو قد، سیہ فام اور سینگوں والے یم دوت انہیں طرح طرح کی ایذائیں دے رہے ہیں۔ کہیں انہیں آگ پر رکھے تیل کے بڑے بڑے کڑاہوں میں تلا جا رہا ہے۔ کہیں ان کے جسم پر سے کھال اتاری جا رہی ہے، کہیں اعضا کاٹے جا رہے ہیں، سست رفتاری سے آرا چلایا جا رہا ہے، آنکھیں نکالی جا رہی ہیں، جلایا جا رہا ہے، کہیں الٹا لٹکا کر سر میں سے مومیائی نکالی جا رہی ہے... یہ مناظر دیکھ کر ہاتھی تھر تھر کانپنے لگا۔ چتر گپت نے کانپتے ہوئے ہاتھی کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ پھر آہستہ آہستہ ہاتھی نے اپنی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

'یہی ہے تمہارا... خطرناک انسان؟' چتر گپت نے طنز کیا
'...جس سے تم ڈرتے ہو...'
'حضور... اجازت ہو تو عرض کروں؟' ہاتھی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
'بے خوف ہو کر کہو۔'
'یہ سب... مُردہ ہیں... مرے ہوئے انسان... آپ نے کبھی زندہ آدمی نہیں دیکھا پربھو... زندہ آدمی بہت خطرناک ہوتا ہے...' کوئی پرانی بات یاد آنے پر ہاتھی نے کانپتے ہوئے کہا۔
'زندہ آدمی؟... کیا ہوتا ہے زندہ آدمی؟' چتر گپت نے غصیلے لہجے میں کہا۔
'خطرناک... بہت خطرناک ہوتا ہے پربھو...'
'شاید یہ ٹھیک کہہ رہا ہے بھگوان...' ایک خادم فرشتے نے آہستہ سے کہا' ...شیر اور چیتے سمیت... دوسرے کئی جانوروں کو بھی میں نے یہی کہتے سنا ہے...'
چتر گپت کچھ دیر خادم کو گھورتے رہے، پھر سخت لہجے میں بولے:
'کسی جونیئر کو ساتھ لے کر زمین پر جاؤ... اور کوئی زندہ انسان لے آؤ...'
نہیں پربھو...' ہاتھی چلایا' یہ ازتھ مت کرنا... اگر زندہ انسان یہاں آ گیا... تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی... تباہی مچ جائے گی...'
'کیسی تباہی؟'
'میں نہیں جانتا... پربھو... مرنے سے پہلے میں نے ایک بار دیکھا کہ آدمی زمین میں سوراخ کر کے... اس میں بارود بھر کر... اور اسے آگ دکھا کر زمین کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا...'
چتر گپت پہلے تو سکتے میں آکر ہاتھی کو کچھ دیر تک دیکھتے رہے پھر خادم فرشتے کی طرف مُڑ کر جلدی جلدی کہنے لگے:
'اس سے پہلے کہ وہ زمین توڑ ہی دے... زندہ آدمی لے آؤ... جاؤ...'
'یہ آپ کیا کرنے لگے ہو بھگوان...' ہاتھی خوف سے کانپنے لگا۔
'خاموش رہو...' چتر گپت نے خادم کی طرف دیکھا جس کے انداز سے ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔
'کچھ پریشانی ہے... دُوت؟'

'ہاں مہاراج... حکم ہو تو بیان کروں...'
'بے خوف ہو کر کہو...'
'مہاراج... ہم نے آج تک زمین سے زندہ آدمی یہاں نہیں لایا... یہ سورگ کے قانون کے خلاف ہے... کل کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے... جوڈیشل انکوائری ہو گئی تو میں پھنس جاؤں گا... اس لیے آپ مجھے تحریری حکمنامہ دے دیں پربھو...' وہ جہاندیدہ خادم فرشتہ تھا۔ کائنات کی تخلیق کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اس لیے اکثر تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں اور حالات بدلتے رہتے تھے۔ وہ سورگ کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھ چکا تھا اور کوئی جوکھم نہیں لینا چاہتا تھا۔
چتر گپت کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔
'مجھے خوشی ہے کہ تم ایک تجربہ کار فرشتے ہو... لیکن... جیسا کہ تمہیں احساس ہو گیا ہے... یہ ایک غیر قانونی آپریشن ہے... اس لیے اسے ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا... لیکن تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو... ہزاروں سالوں سے میرے ساتھ ہو... کسی بات کی فکر نہ کرو... گڑبڑ ہوئی تو میں سنبھال لوں گا... جاؤ... حکم کی تعمیل کرو...'
'ٹھیک ہے پربھو... اگر آپ اخلاقی ذمے داری لیتے ہیں تو...'

خادم فرشتہ سر جھکا کر اُلٹے پاؤں چلتا ہوا واپس گیا اور کچھ فاصلے پر ایک دوسرے خادم فرشتے کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھا پھر چلتے چلتے دونوں ماحول میں تحلیل ہو گئے۔
دونوں زمین کی جانب فضا میں اڑے جا رہے تھے۔
'کیا قصہ ہے...' جونیئر فرشتے نے سینیئر سے پوچھا۔
'حکم ہوا ہے کہ زندہ انسان لے آؤ...'
'کوئی... خاص آدمی ہے؟'
'نہیں... کوئی خاص نہیں... بس کسی کو بھی لے آؤ...'
'تو پریشانی کیا ہے؟... لے آتے ہیں...'
'تم سمجھے نہیں...' زندہ انسان کو یہاں لانا... یہ سورگ کے قانون کے خلاف ہے... کل کو انکوائری ہو گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے...'
'انکوائری ہوئی تو چتر گپت مہاراج جواب دیں گے... ہمیں کیا؟'
'دراصل ہماری آپریشنل کمانڈ یم راج کے پاس ہے...

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

مہاراج چتر گپت کے پاس تو ہم ڈیپوٹیشن پر بھیجے گئے ہیں... ہماری بھی جوابدہی بنتی ہے کہ مہاراج چتر گپت کے غیر آئینی حکم کو ہم نے کیوں مانا... لگتا ہے تمہیں یہاں کے سسٹم کے بارے میں ابھی پورا پتہ نہیں ہے... کب سے ہو اس... انسانی سیکشن میں؟'

'کوئی پچاس ساٹھ سال سے ... جب ہیروشیما... اور... ناگا ساکی میں دھماکے ہوئے تھے... کیوں؟'

'تب تو یہ ابھی کی بات سمجھو... ہیروشیما اور ناگا ساکی... مجھے بھی دن رات اووَرٹائم کرنا پڑا تھا... یم راج کے حکم کے بنا ہی لوگ مر رہے تھے...'

'یم راج کے حکم کے بنا؟... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'

'میں ہزاروں سالوں سے اسی سیکشن میں ہوں۔' سینیئر یم دوت کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری'... رامائن کی جنگ میرے سامنے ہی ہوئی تھی... اور... مہابھارت کی بھی... لاکھوں آدمی مر رہے تھے... اور یم راج کو پتہ ہی نہیں تھا...'

'کیا کہہ رہے ہو؟' جونیئر یم دوت حیرت سے بولا '...لاکھوں لوگ مر رہے ہیں اور یم راج کو پتہ ہی نہیں؟... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟... ناممکن...'

دونوں نے سامنے سے آتے ہوئے ایک سیارچے (asteroid) سے ٹکرا کر اس میں تحلیل ہو کر دوسری طرف سے نکلتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔

'یہ انسان بہت خطرناک جانور ہے...' سینیئر یم دوت بولا '...اور ضدی بھی... میں نے تو ہزاروں سالوں سے انسان کا ارتقا دیکھا ہے... شروع میں انسان کا مقابلہ آگ... بارش... طوفان... برف وغیرہ سے تھا... ان سے بچنے کے لیے انسان نے غاریں ڈھونڈیں... گھر بنائے... کپڑے بنائے... جنگلی جانوروں سے بچنے... اور شکار کے لیے... ہتھیار بنائے... اور اب... اب انسان کے مقابلے میں کوئی بھی نہیں ہے... کوئی جانور... کوئی موسم... کچھ بھی... انسان کا مقابلہ نہیں کرسکتا... اسی لیے انسان کی آبادی اتنی بڑھ چکی ہے کہ زمین زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی... اور... اس لیے اب انسان خود ہی ایک دوسرے کو مار کاٹ کر آبادی کم کرتے رہتے ہیں...'

'بلا وجہ؟'

'نہیں نہیں... وجہ وہ ڈھونڈھ لیتے ہیں...'

'مثلاً...'

'مثلاً...' سینیئر فرشتہ کچھ سوچتا ہوا بولا '...مثلاً... کچھ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ ہمارے دیوتا بڑے ہیں... آؤ ان کی عبادت کریں... کچھ کہنے لگتے ہیں کہ... نہیں... ہمارے دیوتا بڑے ہیں... ان کی عبادت کرو...'

'اور حقیقت میں کس کے دیوتا بڑے ہوتے ہیں؟'

'کسی کے بھی نہیں...' سینیئر فرشتے نے ہنس کر کہا'... اصل میں دیوتا تو ہوتے ہی نہیں... لیکن... جب انسان ماننے لگتا ہے... تو وہ ... دیکھتے ہی دیکھتے... ہو جاتے ہیں...'

'کمال کا جانور ہے...' جونیئر فرشتے نے حیران ہو کر کہا۔

'کون؟'

'یہی انسان... اور کون...'

'اور کیا...' سینیئر بولا '...اور پھر یہ ایک دوسرے کو اس طرح مارتے... کاٹتے ہیں... کہ جسموں میں روحوں کا رہنا ناممکن ہو جاتا ہے... پھر ان حالات میں یم راج کو... ان mass deaths کی post facto sanction دینا پڑتی ہے... مہابھارت... ہیروشیما اور ناگا ساکی میں بھی یہی ہوا تھا... حالات ایسے ہو جائیں تو ہمیں خواہ مخواہ اووَرٹائم کرنا پڑتا ہے...'

'اور... یہ سب... صرف اُن دیوتاؤں کی بڑائی ثابت کرنے کے لیے... جو... ہیں بھی... یا نہیں؟... حد ہو گئی...'

'نہیں نہیں... صرف دیوتاؤں کے لیے نہیں... انسان بہت سی وجوہات ڈھونڈھ لیتا ہے... وہ کئی سارے اختلافات بھی پیدا کر لیتا ہے... مثلاً نظریے کا اختلاف... سیاسی نظریہ... مذہبی نظریہ... عورتوں کا بازار میں انڈرویئر پہننے یا نہ پہننے کا نظریہ... ویلنٹائن ڈے منانے... یا... نہ منانے کا نظریہ... کسی جانور کو کھانے یا نہ کھانے کا نظریہ... کوئی بھی بات ہوسکتی ہے... اور یہ بھی ضروری نہیں کہ واقعی کوئی بات ہو بھی... اچھا اب چپ ہو جاؤ... اور مجھے سوچنے دو کہ زندہ آدمی کو کہاں پکڑنا ہے... اور کیسے لے جانا ہے... اوہ...'

'کیا ہوا؟' جونیئر نے پوچھا۔

'کچھ نہیں...' چاند کی سطح سے ٹکراتے ہی تحلیل ہو کر دوسری جانب سے نکلتے ہوئے سینیئر فرشتے نے کہا'... زمین آ گئی...'

'ارے... یہاں تو اتنے لوگ ہیں... کسی کو بھی اٹھا لیتے ہیں...' جونیئر فرشتہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

'یہ اتنا آسان نہیں ہے... جب ہم مردہ انسان لے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

جاتے ہیں تو... اس کا جسمانی جسم یہیں چھوڑ کر روحانی جسم لے جاتے ہیں... لیکن اب جسم سمیت لے جانے کا حکم ہے... اور اگر جسم سمیت کوئی انسان غائب ہو جائے تو... ایجی ٹیشن ہو سکتی ہے... فائرنگ... پھر موتیں... زمین پر پہلے ہی بڑا کنفیوژن ہے... میں نہیں چاہتا کہ کچھ گڑ بڑ ہو اور اس کی ذمے داری ہم پر آئے... اس لیے کوئی ایسا آدمی دیکھنا پڑے گا جو پہلے بھی اکثر بنا بتائے کہیں چلا جاتا ہو... اور جس کے غائب ہونے پر کسی کو حیرت بھی نہ ہو...'

'لیکن ایسے آدمی کا پتہ کیسے چلے گا... جلدی جلدی میں ہم نے لوگوں کے اعمال نامے بھی نہیں دیکھے...' جونیئر فرشتے نے مایوسی سے کہا اور سینیئر فرشتہ سر ہلا کر رہ گیا۔

اندھیرا ہونے لگا تھا اور روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ دونوں فرشتے باریک بینی سے اطراف و جوانب کا تجزیہ کرتے جا رہے تھے۔ اچانک اندھیرے میں ڈوبی ایک بڑی سی عمارت نظر آئی جس کے ایک کمرے کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی کی جالی سے روشنی چھن کر آ رہی تھی۔

سینیئر فرشتے نے جونیئر کی توجہ اس طرف مبذول کروائی اور دونوں اس طرف بڑھے۔ اندر ایک تنہا آدمی کچھ فائلوں کے کاغذات اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ دونوں فرشتے کھڑکی کے راستے تحلیل ہو کر کمرے کے اندر ظاہر ہوئے اور وہ شخص چونک پڑا۔

'کون ہو تم لوگ؟ اندر کیسے آئے؟'

'ہم سورگ سے آئے ہیں...'

'اچھا اچھا... سورگ ہوٹل سے... لیکن میٹنگ تو ہالی ڈے ریزارٹ میں فکس کی گئی تھی؟'

'پروگرام بدل گیا ہے... اب تمہیں سیدھے سورگ چلنا پڑے گا...'

'گھر میں اطلاع دے دوں...' اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہنے لگا۔ '... گھر والے پریشان نہ ہو جائیں... ہاں ہیلو... مائی ڈیئر... میں کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا ہوں... یہی کوئی دو چار دن... ہاں ہاں... سرکاری کام ہے... ہاں... ٹھیک ہے... اوکے ڈارلنگ... بائی...'

'بیوی کو بھی خوش رکھنا پڑتا ہے بھائی۔' اس نے دونوں کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ '... تم نے اپنا نام نہیں بتایا...'

'ہمارے نام نہیں... نمبر ہوتے ہیں...'

'بڑے پُر اسرار ہو رہے ہو یار...' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا '... مجھے بھی ایسے لوگوں کے ساتھ کام کر کے مزہ آتا ہے جو صرف اپنے کام سے کام رکھیں... ٹینڈر بدل دینے کا کام کوئی کم جوکھم بھرا نہیں ہوتا... تمہارے کام کرنے کے طریقے سے پکڑے جانے کا خطرہ نہیں رہتا... ہے نا...'

'پکڑے جانے کا؟ کون پکڑے گا؟' سینیئر فرشتہ بولا اور وہ اسے گھورنے لگا۔

'اچھا... تو یہ جو میں کر رہا ہوں... چلو... سمجھ لیتے ہیں یہ خدمتِ خلق ہے... اوہو... لیکن تم لوگ اندر کیسے آئے؟ دروازہ تو بند ہے...' اس نے چونک کر کہا۔

'ہم کہیں بھی آ جا سکتے ہیں... تم اس کی فکر مت کرو...'

'اور... تم نے... یہ کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں؟... بہت قیمتی دکھائی دیتے ہیں...'

'یہ سورگ کا ڈریس کوڈ ہے...'

اس آدمی نے ہاتھ بڑھا کر ایک فرشتے کے بڑے لمبے چوڑے مہین شال کی سلوٹوں کو چھونے کی کوشش کی جس سے شعائیں نکل رہی تھیں۔ لیکن شال اس کی پکڑ میں ہو کر بھی اس کی انگلیوں سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ڈر گیا۔

'گھبراؤ نہیں... ہم تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آئے...' سینیئر نے کہا '... ہم سورگ ہوٹل سے نہیں... واقعی سورگ سے آئے ہیں... تمہیں لینے...'

'تو اس کا مطلب ہے میں مر گیا ہوں؟'

'نہیں... تم زندہ ہو... بات یہ ہے کہ... سورگ میں ایک سچوئشن ہو گئی ہے... اور وہاں کسی زندہ آدمی کی ضرورت ہے...'

'اوہو... پوری بات سناؤ...'

سینیئر فرشتے نے ساری بات کی وضاحت کر کے کہا:

'یقین کرو... تمہیں صحیح و سلامت زمین پر واپس پہنچا دیا جائے گا... اور... تمہارے تعاون کے صلے میں ہم تمہیں ایک پیشکش بھی کرتے ہیں...'

'کیسی پیشکش؟'

'سورگ میں اپنے تجربات پر تم ایک کتاب بھی لکھ سکتے ہو... کاپی رائیٹ تمہارے ہوں گے...'

'سورگ کے بارے میں ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں...'

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

اس نے بے زاری سے کہا'...کتاب کیا لکھنی ہے...تم یم دوت نہیں ...فرشتے ہو...رائیٹ؟'

دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

'لیکن دراصل تم دونوں ایک ہی ہو... جب تمہیں یم دوت کا رول کرنا ہوتا ہے تو کاسٹیوم...اور...گٹ اپ... بدل لیتے ہو...رنگ سیاہ کر لیتے ہو اور سر پر سینگ اُگا لیتے ہو...رائیٹ؟'

'ہاں... لیکن تمہیں کیسے پتہ؟' فرشتہ حیرت سے بولا۔

'دیکھا...' آدمی معمول پر آ گیا تھا' ..تمہارے بارے میں ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں...اور سورگ کی کوئی بات ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہے... وہاں کا...اور نرک کا بھی... پورا سائیٹ پلان ہمارے پاس ہے...ارے بھائی... یہاں کے فٹ پاتھوں پر...ریلوے پلیٹ فارموں پر...سورگ...اور نرک کی ایک ایک تفصیل کے بارے میں ہزاروں کتابیں ملتی ہیں جنہیں پڑھ پڑھ کر لوگ بور ہو چکے ہیں... دراصل... سورگ کا آئیڈیا...ہمارا ہی تھا...اور...اب ہم زمین ہی پر سورگ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں...'

دونوں فرشتے اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

'چلو... جہاں چلنا ہے... یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے خائف ہوں...' آدمی نے لاپرواہی سے کہا' ..لیکن پہلے... ایک ضروری کام نمٹا لوں...'

آدمی نے کمپیوٹر کا کی بورڈ نزدیک سرکایا اور سدھی ہوئی انگلیوں سے کچھ ٹائپ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پرنٹر میں سے پرنٹ آوٹ نکالا، مہر لگا کر دستخط کیے اور سلیقے سے تہ کر کے اسے ایک لفافے میں ڈال کر بند کیا اور لفافے پر کچھ لکھنے لگا۔ پھر لفافہ قمیض کی اوپری جیب میں رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

'چلو...'

'وہ ہاتھی...شاید ٹھیک ہی کہتا تھا...' سینئر فرشتے نے آدمی کے اعتماد سے مرعوب ہو کر سرگوشی میں کہا' ...اسے لے جا کر ہم کہیں واقعی غلطی ہی نہ کر رہے ہوں...'

'کون سا ہاتھی؟' جونیئر نے پوچھا۔

'کچھ نہیں...چھوڑو...لمبی کہانی ہے...'

دونوں فرشتوں نے اس کے دونوں اطراف میں کھڑے ہو کر اسے چھوا اور پھر وہ چھت سے ٹکراتے ہی تحلیل ہو کر دوسری طرف سے نکل گئے۔

چتر گپت اپنے کبھی نہ ختم ہونے والے کام میں مشغول تھے۔ انواع واقسام کے جاندار، چرند، پرند ان کے سامنے قطار بند تھے اور وہ ایک ایک کر کے سبھی کی فائلوں کا نپٹارا کر رہے تھے۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر تینوں کو دیکھا اور فائل پرے سرکا کر بولے:

'آ گئے آپ لوگ؟'

'ہاں پربھو...'

'تو یہ ہے انسان...' چتر گپت نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا'... ہاتھی اور طوطے کو بلاؤ...'

ہاتھی اور طوطے نے آتے ہی انسان کو دیکھا تو تھر تھر کانپتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔

'سیدھی طرح کھڑے رہو...' چتر گپت نے تحکمانہ لہجے میں کہا' ...یہاں کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا...'

'رحم... پربھو...رحم...'

'تو تم ہو زندہ انسان؟' چتر گپت نے دونوں کو نظر انداز کر کے آدمی سے کہا'...جس نے زمین پر تاناشاہی مچا رکھی ہے؟'

'جی ہاں...اور آپ کی تعریف جناب والا؟'

'ہم... چتر گپت ہیں ...ہم لوگوں کی تقدیروں کا فیصلہ کرتے ہیں...'

'اگر گستاخی نہ سمجھیں...تو نہایت ادب سے میری گزارش سن لیں جناب...آج سے آپ کا فیصلے کرنے کا اختیار چھین لیا گیا ہے ...آپ کا ٹرانسفر ہو گیا ہے محترم...اور یہ رہا آپ کا ٹرانسفر آرڈر...'

آدمی نے قمیض کی اوپری جیب سے لفافہ نکال کر بڑے احترام سے چتر گپت کو پیش کیا۔ چتر گپت نے لفافہ ہاتھ میں لے کر دیکھا۔

'ہوں ں ں...ایڈریس تو میرا ہی ہے...' چتر گپت نے لفافہ چاک کیا، اندر سے تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر پڑھا اور پشتگاہ سے ٹیک لگا کر طویل سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

'میں بہت تھک گیا ہوں...' کچھ دیر بعد چتر گپت نے آنکھیں کھول کر پُرسکون لہجے میں کہا'... جب سے دنیا بنی ہے...تب سے میں بنا رکے کام کرتا آ رہا ہوں... اچھا ہوا تم آ گئے ...اسی وقت چارج لے لو...'

'یہی مناسب ہوگا محترم ... آرڈر میں بھی فوری طور پر چارج سنبھالنے کے لیے کہا گیا ہے...'

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

چترگپت کے جانے کے بعد آدمی اطمینان سے شہ نشین پر بیٹھ کر ہاتھی اور طوطے کو خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا۔

'تو... یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے...' اس نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ ہاتھی اور طوطا کپکپاتے ہوئے چکرا کر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ آدمی نے دونوں فرشتوں سے کہا '...خیر انہیں بعد میں دیکھوں گا... آرڈرز رجسٹر لاؤ...'

فوراً رجسٹر پیش کیا گیا۔ آدمی کچھ دیر تک آرڈرز رجسٹر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نیا آرڈر لکھ کر سینیئر فرشتے کو بلایا۔

'یہ نیا آرڈر لاگو ہونا چاہیے... ابھی... اور اسی وقت...'

سینیئر فرشتے نے آرڈر پڑھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا:

'اس سے سب گڑبڑ ہو جائے گا مہاراج... سورگ کا توازن بگڑ جائے گا... سزا اور جزا کا قانون ہی ختم ہو جائے گا...'

'تم مجھے قانون سمجھاؤ گے؟' آدمی نے چلا کر کہا۔ '... تمہارا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے... مجھے سمجھانا نہیں... جاؤ تعمیل کرو... حقیر فرشتے...'

حکم کی تعمیل شروع ہو گئی۔ تمام نیک انسانوں، رشیوں اور تپسیا میں مستغرق مُنیوں کو سورگ سے نکال نکال کر نرک میں بھیجا جانے لگا۔ گناہوں کی سزا بھگت رہے گناہگاروں کو نرک سے نکال کر سورگ میں بھیجا جانے لگا۔ یہ ایک عدیم المثال صورت حال تھی۔ ایک طرف نرک کے درجۂ حرارت میں جھلسنے والے رشیوں مُنیوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی اور دوسری طرف سورگ کی آسائشوں میں پہنچنے والے گناہگاروں کے قہقہوں کی آوازیں تھیں۔ ان ملی جلی آوازوں کے بتدریج بڑھتے ہوئے بے ہنگم حجم سے سورگ کا سمعیاتی توازن متزلزل ہونے لگا تو سورگ کی انتظامیہ کا ابدی سکون بھی درہم برہم ہو گیا۔ سبھی اپنے اپنے خلوت خانوں سے باہر نکل آئے۔ سورگ ہچکولے کھاتے ہوئے ڈول رہا تھا۔ یم راج نے فوراً چترگپت کو طلب کر کے رپورٹ مانگی لیکن چترگپت نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تو ٹرانسفر ہو چکی ہے۔ یم راج نے ٹرانسفر آرڈر دیکھا تو اس پر بھگوان برہما کے دستخط دیکھ کر ماتھا پیٹ لیا۔

'اس آرڈر کی اطلاع مجھے کیوں نہیں دی گئی؟' یم راج نے متنکرانہ لہجے میں کہا۔ '...کیا میرے اختیارات بھی چھین لیے گئے ہیں؟'

اس اثنا میں باقی دیوتا بھی آ گئے تھے۔ سب بھگوان برہما کے پاس گئے تو انہوں نے حیران ہو کر کسی قسم کا حکمنامہ جاری کرنے سے ہی انکار کیا۔ آخر چترگپت نے سارا قصہ بیان کیا تو برہما بولے:

'اس آدمی کو چارج دینے سے پہلے مجھ سے تصدیق تو کر لی ہوتی...'

'میں نے اس کی ضرورت اس لیے نہیں سمجھی... پربھو... کہ سورگ میں تو آج تک کسی نے جھوٹ نہیں بولا...' چترگپت نے تلخی سے کہا۔

'خیر... ' بھگوان برہما نے آدمی کا آرڈر فوری طور پر منسوخ کیا اور کچھ سوچتے ہوئے بولے... 'اس آدمی کو پیش کرو...'

فوراً آدمی کو پیش کیا گیا۔

'تمہیں پتہ ہے کہ جعلی دستاویز کے استعمال سے نرک اور سورگ کے باسیوں کا تبادلہ کر کے تم نے کتنا بڑا غیر قانونی کام کیا ہے؟'

'اچھا؟' آدمی غصیلے لہجے میں بولا '... میں نے غیر قانونی کام کیا ہے... اور... کسی زندہ آدمی کو زمین سے پکڑ کر سورگ میں لانا... کس قانون کے تحت کیا گیا ہے؟... یہ کون سا اصول ہے؟'

سب خاموش ہو گئے۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہاتھی بھی دوڑتا ہوا آ گیا۔

'میں نے کہا تھا نا پربھو... آپ نے زندہ آدمی نہیں دیکھا...' اس نے ہانپتے کانپتے کہا '...اب میرا کیا ہو گا؟'

پوری بات سن کر برہما معذرتی انداز میں بولے:

'کچھ نہیں ہو سکتا... ہم زمین پر آدمی کے کام میں دخل اندازی نہیں کر سکتے... اور... سچ پوچھو تو... ہمیں بھی اسی نے بنایا ہے... ہماری تخلیق بھی اسی نے کی ہے... اس لیے... اس کی مخالفت کرنے کے بجائے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرو...'

پھر برہما کے حکم پر سب دوزانو ہو کر آدمی کو سلام کرنے لگے۔

'اور... تمہیں تو... میں نے اپنے پاؤں سے نہ کچلا... تو کچھ نہ کیا...' ہاتھی نے آدمی کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

'میں سب سن رہا ہوں...' آدمی بہ آواز بلند غرایا۔

ہاتھی بوکھلا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور سلام کے انداز میں سونڈ کو بار بار ماتھے پر لے جانے لگا۔

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

سقوط

■ بلراج بخشی

گشت پر نکلی پلٹن پر اچانک باڑ ماری گئی تھی۔

'لیٹ جاؤ.....لیٹو.....اور پوزیشن لو.....رینگو.....آڑ لو آڑ.....' لیفٹیننٹ گاشل حلق پھاڑ کر چلایا اور خود بھی ایک پتھر کی اوٹ میں رینگ گیا۔

وہ چلا کر یہ کاشن نہ دیتا تب بھی اس کی پلٹن نے یہی کیا ہوتا۔ کیونکہ میدان میں اترنے سے پہلے اس قسم کی جنگی مشقیں فوجیوں کی فطرت ثانی بن چکی ہوتی ہیں۔

لیکن پہلے ہی ایکشن میں سینکڑوں گولیاں چل گئی تھیں۔ یہ اسپرے فائر تھا۔ ایک ڈیڑھ منٹ تک خودکار رائفلوں کی ریٹ ٹیٹ مسلسل سنائی دیتی رہی۔ پھر فائرنگ بند ہوگئی اور جنگل کا سناٹا مزید گہرا لگنے لگا۔ لیفٹیننٹ گاشل نے اپنے ہانپنے پر قابو پاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی ہلچل نہیں تھی۔ اگلے چند لمحے فیصلہ کن ہوسکتے ہیں، اس نے سوچا۔ ابتدائی طور پر حیران کردینے والا دشمن ان کے مکمل خاتمے کے لیے اب ان کی گھیرابندی تنگ کرے گا۔

گاشل نے سر اٹھا کر ہر طرف دیکھا لیکن کہیں کوئی حرکت نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جنگل کا یہ ابدی سکون کبھی نہ ٹوٹا ہو۔ ایک ایک لمحہ ضروری ہے، اس نے سوچا اور پاس پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا کر زمین کی سطح کے ساتھ ساتھ ہی ایک جانب نشیب میں اچھال دیا۔ جس جگہ پتھر گرا تھا وہاں کئی اطراف سے فائرنگ ہونے لگی اور پھر خاموشی۔

ہشیار ہیں، لیفٹیننٹ گاشل نے سر ہلایا۔ لیکن اس نشیب میں پتھر گرنے کی جگہ کو نشان زد کر لینے کا مطلب یہی تھا کہ دشمن ابھی combat زون میں نہیں بلکہ بلندی پر تھا۔ فوری طور پر کچھ کرنا چاہیے، اس نے سوچا۔ لیکن دشمن کی پوزیشن کا اندازہ کیے بنا یہاں سے ہلنا بھی خودکشی ہوتی۔ اس نے ہیلمٹ اتار کر رائفل کی نال کے اگلے سرے پر رکھی اور دونوں ہاتھوں سے رائفل پکڑ کر کہنیوں اور گھٹنوں کے بل چڑھائی کی جانب رینگنے لگا۔ رائفل کی نال پر رکھی ہیلمٹ کی سطح خود اس سے کم سے کم ایک فٹ اونچی تھی۔

تقریباً دس منٹ تک وہ یوں ہی بلندی کی جانب رینگتا رہا اور ایک بڑی چٹان کے پیچھے رک کر سانسیں درست کرنے لگا۔ پھر اس نے غور سے گردونواح کا جائزہ لیا۔ دور دور تک چھدری جھاڑیاں تھیں اور کہیں کہیں چھوٹی سی چٹان کہلانے لائق بڑے بڑے پتھر جن کے پیچھے دشمن کے گھات لگا کر بیٹھے ہونے کا امکان ہوسکتا تھا۔

یہاں سے زندہ بچ نکلنا ممکن نہیں، گاشل نے سوچا۔ دشمن نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہوگا۔ لڑ مرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، یا پھر ہتھیار ڈال دو۔ لیفٹیننٹ گاشل نے کچھ دیر سوچا اور پھر فیصلہ کن انداز میں سر ہلا کر ٹرانسیور کا سوئچ آن کیا اور آہستہ سے بولا:

'ہیلو چارلی.....چارلی.....ڈو یُو ریڈمی.....چارلی.....اوور.....'

'یس آئی ریڈیُو.....ایلفا.....سر.....'

'گڈ.....ڈیمیج رپورٹ.....اینڈ گوئنگ.....'

'ہمارے نو آدمی ختم ہوگئے سر.....'

'اسکاوٹ.....کہاں ہیں؟'

وہ تھوڑی دیر سنتا رہا اور اس نے اطمینان کی سانس لی۔ میمنہ سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا لیکن میسرہ کے دونوں جوڑے محفوظ تھے۔ دراصل فوج کے گشتی دستے کے اگلے سرے پر دونوں اطراف میں بچھو کے بازوؤں کی طرح نیم قوس میں سپاہیوں کے دو دو جوڑے ہوتے ہیں جو فوج سے آگے کچھ فاصلے پر رہ کر چھپتے چھپاتے ہوئے دشمن کی سرگرمی پر نظر رکھتے ہیں اور عقب میں آرہی اپنی فوج کو باقاعدہ آگاہ کرتے ہیں۔

'.....اوکے.....چارلی.....دشمن ہمارے دائیں طرف اونچائی پر ہے.....' اس نے کمر پر لگی بیلٹ پر ایک ہولسٹر سے سگنل پسٹل نکالا۔ '.....میں میگنیشیم فلیئر فائر کررہا ہوں.....انہوں نے ہمیں حیران کیا ہے تو کچھ ہم بھی انہیں حیران کریں.....اپنے آدمیوں سے کہو کہ فلیئر کو دیکھتے ہی دائیں طرف چڑھائی پر رینگیں.....لیکن نو فائرنگ.....یہ چارج ایکشن ہوگا.....فلیئر ختم ہوتے ہی رک کر پوزیشن لے لیں.....اور اگلے فلیئر کا انتظار کریں.....ہر فلیئر تیس سیکنڈ کا ہوگا.....کوئی شک؟'

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

'نوسر....'

'او کے ..... یہ ہدائتیں پہنچا کر رپورٹ کرو .....
اوور....'

تھوڑی دیر بعد چارلی نے رپورٹ دی تو گاشل نے ٹرانسیور میں کہا:

'او کے..... چارلی.....بیس سیکنڈ.....نو و و و...... فائرنگ .....اینڈ......ریڈی فار چارج ایٹ کمانڈ.....اووَر اینڈ آوَٹ.....'

لیفٹیننٹ گھوشل نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر سگنل پسٹل کا رخ آسمان کی جانب کر کے فائر کر دیا۔ روشنی کی ایک پتلی سی لکیر بلندی کی جانب بڑھی اور پھر ایک جھماکے کے ساتھ چاروں اطراف میں نیلے رنگ کی تیز روشنی پھیل گئی۔ گاشل نے زیادہ احتیاط کو طاق پر رکھا اور تیزی سے رینگتا چڑھتا چلا گیا۔ یہ وقت زیادہ احتیاط کا تھا بھی نہیں کیونکہ نہ چاہتے ہوئے بھی دشمن کی آنکھیں اس نیلی روشنی کو دیکھ رہی ہوں گی۔ فلیئر کی روشنی تیس سیکنڈ تک فضا میں معلق رہی اور پھر معدوم ہوگئی۔ گاشل نے چند سیکنڈوں بعد ہی ایک اور فائر کیا اور بڑھتا گیا۔ دشمن کی حیرت کا فائدہ اٹھانے کا یہی موقع تھا۔ تیسرے فلیئر کی نیلی چکا چوند ختم ہوتے ہی گاشل نے آڑ لے لی اور سانسیں درست کرنے لگا۔ اس نے گھڑی دیکھی، ایک منٹ ہو چکا تھا۔ اس کے جوان بھی سانسیں درست کر چکے ہوں گے، اور اس سے زیادہ اب پرے باندھنے کا نہ تو وقت تھا نہ گنجائش۔ اس نے رائفل پر سنگین چڑھایا۔ فیصلے کی گھڑی، لیفٹیننٹ گاشل نے سوچا۔

'ریڈی چارلی؟' گاشل نے ٹرانسیور کا سوئچ آن کر کے پوچھا۔

'ریڈی ایلفا.....کمانڈ.....سر.....'

'چا آ آ آ آ ر ج......' وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور پوری قوت سے چلاتے ہوئے جھک کر فائرنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے جوان بھی چارج کا آوازۂ جنگ لگاتے ہوئے فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن یہ کوئی طویل جھڑپ نہیں تھی۔ دراصل گاشل کی اس گستاخانہ حکمت عملی نے دشمن کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ مگر صاف طور پر اب مبارزت کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ گرنے لگے۔ ہر طرف سے چیخ و پکار، آہوں اور کراہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ انسانوں کے قدیم ترین مشغلوں میں سے ایک قتل و غارت کے اس سلسلے میں گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں بھی سنائی دے رہی تھی اور سنگینوں کی غچاغچ بھی۔ اب پھر خاموشی چھانے لگی جسے کوئی تھکی تھکی سی کراہ مجروح کر دیتی تھی۔

لیفٹیننٹ گاشل ہانپتے ہوئے جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک اسے ایک جانب سے اسے ہلکی سی آواز سنائی دی اور وہ جھٹکے سے ادھر مڑا۔ تقریباً تیس گز کے فاصلے پر ایک مسلح دشمن اسے رائفل کی زد پر لیے کھڑا تھا۔ گاشل کے کچھ کرنے سے پہلے ہی دشمن نے وقت ضائع کیے بغیر ٹرائگر دبا دیا۔ لیکن خالی آواز آئی، میگزین خالی ہو چکی تھی۔ گاشل نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی رائفل کی نال سیدھی کی۔ یہ الوداعی تقریر کا وقت نہیں تھا اس لیے رائفل کی نال سیدھی کرنے، دشمن پر شست باندھنے اور ٹرائگر دبانے کا عمل ایک ہی تسلسل میں تھا۔ لیکن صرف ٹرائگر کی خالی آواز ہی آئی۔ اس کی میگزین بھی خالی تھی اور اب میگزین لوڈ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ہولسٹر سے اعشاریہ پنتالیس کا ریوالور نکالنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ بے سوچے ہی بُلٹ پروف جیکٹ کے اندر جھپٹا اور ایک ہینڈ گرنیڈ کے ساتھ سرعت سے باہر آ گیا۔ گاشل کا ہاتھ منہ کے پاس آیا۔ اس نے دانتوں کے ساتھ سیفٹی پن کھینچ کر گرنیڈ کو مسلح کیا اور جیسے ہی پھینکنے کی پوزیشن میں ہاتھ پیچھے گیا اس نے دیکھا کہ دشمن کا ہاتھ بھی گرنیڈ کے ساتھ اسی پوزیشن میں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ گاشل کا دماغ تیزی سے تخمینہ لگانے لگا۔ اگر کسی نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تو دوسرا گرنیڈ لانچ کر دے گا۔ اور اگر ایک نے گرنیڈ پھینکنے کی کوشش کی تو دوسرا بھی پھینک دے گا اور اس طرح دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ دونوں کے لیے راہِ بے مفر کی صورت تھی۔ دشمن بھی اسی نتیجے پر پہنچ گیا لگتا تھا کیونکہ اب اس کے ہونٹ ایک تلخ مسکراہٹ کی شکل میں کھنچ کر اس کے دانتوں پر پھیل گئے تھے۔

'کوئی بھی نہیں بچے گا.....' دشمن اونچی آواز میں چلایا۔

اس نے تیزی سے نیچے جھک کر کچھ اٹھایا اور اسے غور سے دیکھتا ہوا اس کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔

گاشل نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کا انگوٹھا سختی کے ساتھ گرنیڈ کے لیور پر جما ہوا تھا۔ جب تک انگوٹھا لیور پر تھا گرنیڈ

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

پھٹ نہیں سکتا تھا اور لیور پر سے انگوٹھا ہٹاتے ہی گرنیڈ آٹھ سیکنڈ کے اندر پھٹ جاتا۔ اگر وہ لیور پر سے انگوٹھے کا دباؤ ہٹا کر پانچ سیکنڈ کا انتظار کرے تو آخری تین سیکنڈوں میں وہ اسے دشمن پر اچھال سکتا ہے، اس نے سوچا۔ لیکن دشمن بھی اس امکان کو سمجھ گیا تھا اور جلد ہی اس نے مزید قریب آ کر درمیانی فاصلہ بہت کم کر لیا تھا۔

گاشل نے دل ہی دل میں دشمن کے اس فعل کی تعریف کی۔ اب ان کا درمیانی فاصلہ اتنا کم تھا کہ کوئی بھی گرنیڈ استعمال کرتا تو دونوں کا خاتمہ یقینی تھا کیوں کہ گرنیڈ کا حلقۂ مار آٹھ نو میٹر تو ہوتا ہی ہے۔

'کوئی فائدہ نہیں دوست....' دشمن مزید قریب آ گیا '.... میں حساب لگا چکا ہوں....کوئی راستہ نہیں ہے....'

اب ان کے درمیان چھ سات فٹ کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔

'کیا خیال ہے....' دشمن نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا '....دونوں کے مرجانے کا کیا فائدہ....فتح کا جشن منانے کے لیے ایک تو زندہ رہے....'

گاشل کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

'میرا خیال ہے کہ.....سیفٹی پن گرنیڈ میں واپس ڈال دوں تو کوئی نقصان نہیں ہوگا....' دشمن نے کہا

'اوں.....ہوں....ابھی نہیں.....اپنی رائفل زمین پر ڈال دو....' گاشل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

دشمن نے کچھ سوچا پھر سر ہلاتے ہوئے رائفل زمین پر ڈال دی۔ گاشل نے بھی اس کی تقلید کی اور بولا:

'ریوالور بھی....'

دونوں نے بیلٹ سے اپنے ہولسٹر ہی کھول کر پھینک دیے۔ دشمن نے گرنیڈ کے لیور سے انگوٹھا ہٹایا اور سیفٹی پن واپس ڈال کر گرنیڈ واپس جیب میں ڈال دیا۔ گاشل اس کی کاروائی دیکھتا رہا اور پھر کچھ دیر بعد اس نے بھی ویسا ہی کیا اور دشمن نے طویل سانس لی۔

'میں زوگو واڈی ہوں.....ایم اے اکونومکس....'

'ایم اے اکونومکس ہونے سے تمہارے جرم کم ہو جاتے ہیں کیا؟' لیفٹیننٹ گاشل کا لہجہ خشک تھا۔

'نہیں.....تمہیں بتانا ضروری ہے کہ ہماری صفوں میں خاصے تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہیں.....محض گنوار نہیں.....ویسے

ے ے....' وہ خشخشی داڑھی کو سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا '....تمہارا ایکشن غیر متوقع تھا.....لیکن قابل تعریف .... you took me by surprise.....ورنہ تم سب کا مرنا طے تھا.....لیکن تمہارے ایکشن سے میرے تمام لوگ بھی ختم ہو گئے ..... daring..... تمہارے سرمایہ دار آقا اپنے کارندوں کو اچھی ٹریننگ دیتے ہیں....'

'میں پیشہ ور سپاہی ہوں....'

'اور میں پیشہ ور انقلابی.....ویسے لیفٹیننٹ.....یہ کمال کی سچوئشن ہے......اگر ہم ایک دوسرے سے ساتھ رہیں تو ہمیں ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں.....لیکن یہ.....یہ چھ سات فٹ کا فاصلہ درمیان میں رکھنا ہوگا تاکہ ہم میں سے کوئی دوسرے پر اچانک حملہ نہ کر دے....'

'مرنے سے ڈرتے ہو؟' گاشل کی پیشانی پر استفہامیہ بل پڑ گئے۔

'نہیں......ایک اور لڑائی کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں....'

اچانک گاشل کے ٹرانسیور پر آوازیں آنے لگیں:

'ہیلو.....زیرو نائن.....کالنگ ایلفا.....زیرو نائن کالنگ ایلفا.....اوور....'

گاشل نے سوئچ آن کیا اور دشمن پر سے نظر ہٹائے بغیر صرف یہ کہا:

'اِن گیجڈ.....آؤٹ....'

سوئچ آف کر کے وہ جھٹکے سے اٹھا اور بولا:

'یہاں سے نکلو.....اور کور ڈھونڈو.....کچھ ہی منٹوں میں ریکی کے لیے جہاز یہاں مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگیں گے .....ان جنگلوں سے واقف ہو؟'

'اچھی طرح'

'چھتاروں کی طرف چلو .... گھنے درخت .... جن میں شاخیں اور پتے گھنے ہوں....'

زوگو واڈی نے سر ہلایا اور پھر دونوں تیز قدموں سے ایک جانب چلنے لگے۔ لیکن ان اطراف میں گھنے درخت تھے ہی نہیں۔ وہ ایک چھوٹی سی گھنی بانسواڑی میں چھپے رہے۔ جہاز آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ دونوں نے اپنا اپنا لایا ہوا کھانا

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

کھایا اور بیٹھ گئے۔

'کیا پروگرام ہے؟' گاشل نے پوچھا۔

'پروگرام؟.....اس نقصان کے ..... باوجود.....ہماری جدوجہد جاری رہے گی....' زوگو واڈی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

'میں تمہارے اس وقت کے پروگرام کے بارے میں پوچھ رہا ہوں...... مستقبل کے تمہارے قاتلانہ منصوبوں کے بارے میں نہیں...'

'قاتلانہ منصوبے؟' واڈی نے مجروح لہجے میں کہا '.....ہم لوگ ایک مقصد کے لیے جدوجہد کررہے ہیں لیفٹیننٹ.... یہ سڑا گلا نظام....'

'بالکل ..... بہت بڑا مقصد....' گاشل نے زہریلے لہجے میں کہا '.....اور یہ مقصد صرف سرحدی ریاستوں میں نظر آتا ہے....'

'کیا مطلب؟'

'صرف وہ ریاستیں ..... جو ملک کی سرحدوں پر واقع ہیں.....صرف وہاں کے باشندوں کے ساتھ ہی ناانصافیاں، مغربی تہذیب کی بالادستی.....ظلم.....انسانی حقوق کی پامالی.....اور نہ جانے کیا کیا ہوتا رہتا ہے.....اتنے بڑے ملک میں.....کہیں اور.....کچھ نہیں ہوتا.....کیوں؟'

'یہ تو ہر جگہ ہو رہا ہے....' زوگو واڈی آہستہ سے بولا 'مگر تمہیں نظر نہیں آتا.....تمہارے آگے کچھ ٹکڑے پھینک کر تمہیں اس نظام کا محافظ بنا دیا گیا ہے اور بس..... یہ جو تم نے لیفٹیننٹ کی وردی پہن رکھی ہے..... کبھی کسی سیاستدان کے بیٹے نے پہنی ہے؟..... یا کسی سرمایہ دار کے بیٹے نے؟.....تم نے کبھی دیکھا کہ کسی لیڈر یا وڈیرے کا بیٹا.... پولیس کا ڈائریکٹر جنرل یا..... یا..... چیف آف آرمی اسٹاف بنا ہو؟.....وہ نہیں بنتے.....وہ صرف حکمران بنتے ہیں.....تمہاری طاقت کے زور پر.....تم جیسے عام لوگ.... جو بہت سستے میں مل جاتے ہیں..... جنہیں جمہوریت اور وطن پرستی کا سبق پڑھا کر بندوق تھما دی جاتی ہے کہ ان کے دشمنوں کو مارو.....تو انعام ملے گا.... یا خود مرجاؤ....ایوارڈ ملے گا.....آج تم وہی تو کررہے تھے....'

'لیکچر مت دو....' گاشل کا لہجہ خشک تھا '.... سرمایہ داروں کو ختم کرکے ان کی دولت غریبوں میں تقسیم کریں گے.....اور اپنا نظام حکومت بنائیں گے .... پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہو تم لوگ.....ابھی تم نے کہا کہ پولیس اور فوج میں عام آدمی ہوتے ہیں..... تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری گولی سے جب ایک فوجی مرتا ہے تو اس کی جگہ لینے کے لیے دس لوگ آجاتے ہیں.....گاؤں کی زمینیں بیچ کر پچاس پچاس ہزار کی رشوت لے کر.....کب تک مقابلہ کر سکو گے؟.....ہم ہیں نا ان وڈیروں کی حفاظت کے لیے.....اور.....تم ہو ہی کتنے؟'

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

'یہاں سے فوراً نکلنے کی کوشش کرو.....' لیفٹیننٹ گاشل بولا '.....انکوائری کے لیے کوئی فوجی ٹکڑی آرہی ہوگی.....'

'ایک دو دن تو کوئی نہیں آئے گا.....' زوگو واڈی نے ہنس کر کہا '....انہیں پتہ ہے کہ ہم یہیں کہیں گھات لگائے چھپے ہوں گے.....مزید شکار کے انتظار میں.....ویسے بھی یہاں سے نکل کر کہاں جاؤ گے لیفٹیننٹ؟'

'کیا مطلب؟'

'تمہارے تمام آدمی ختم ہوگئے.....مگر تم نے اپنے کمان افسر سے رابطہ نہیں کیا.....مرگئے ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی.....تم بچ گئے.....لیکن ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ نہیں کیا....'

گاشل اسے کچھ دیر تک متفکرانہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا:

'ہوں ں ں ں.....شاید تمہارا خیال ٹھیک ہے.....مجھ سے رپورٹ مانگی جائے گی.....کورٹ آف انکوائری ہوگی.....مجھ پر مجرمانہ غفلت کا الزام بھی لگ سکتا ہے.....'

اچانک ایک تیز رفتار جیٹ طیارہ فائرنگ کرتے ہوئے ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ دونوں زمین پر اوندھے منہ گر گئے اور سرعت سے رینگتے ہوئے چٹانوں کی اوٹ میں ہوگئے۔ جیٹ طیارے نے تین بار پھر لوٹ کر اسی محدود رقبے میں مشین گن سے فائرنگ کی۔ ان کے آس پاس کی مٹی اچھلتی رہی یا گولیاں چٹانوں سے ٹکراتی رہیں۔ جیٹ طیارہ چلا گیا۔

'تم نے دیکھا لیفٹیننٹ ..... فائیٹر جیٹ نے اسی علاقے میں فائرنگ کی.....یعنی اسے ٹارگٹ ایریا دیا گیا تھا..... کیسے؟' زوگو واڈی نے زمین پر چت لیٹے لیٹے کہا۔

'اوہ.....اوہ.....' کچھ دیر بعد گاشل کے منہ سے بے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

اختیار نکلا'..... اسکاوٹ ..... میری بائیں جانب والے اسکاوٹ نشیب میں تھے .....اور.... محفوظ تھے ..... یقیناً انہوں نے ریکی کی ہوگی .....اور ہم دونوں کو سکون سے باتیں کرتے دیکھ کر رپورٹ دے دی ہوگی .....او مائی گاڈ .....وہ تو مجھے واجب القتل قرار دے چکے ہوں گے .....اوہو.....تو..... میرا کورٹ مارشل طے ہے.....'

'میں نے غلط تو نہیں کہا تھا.....'زوگو واڈی نے ہلکا سا استہزائیہ قہقہہ لگایا'.....مجبوری کی حالت میں بھی دشمن کے ساتھ بات کرتے دیکھ کر تمہارے سرمایہ دار آقا غداری کا الزام لگا دیں گے.....'

'لیکن ..... میرا خیال ہے کہ..... تمہارا بھی کچھ کچھ یہی حال ہے.....'لیفٹیننٹ گاشل کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا.'.....گھاتی حملے میں پیشگی گاڑا لگائے بیٹھا دشمن ہمیشہ ابتدائی فائدے میں رہتا ہے..... تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ گھات لگانے کے باوجود تمہارے تمام آدمی کھیت رہے..... کیا تم نے حکومت کے ساتھ اپنے جنگجوؤں کو مروانے کا سودا کیا تھا؟..... کیا تم بک گئے تھے زوگو؟'

زوگو کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اب گاشل کے قہقہہ لگانے کی باری تھی۔

'میرے سامنے تو جیل ہے ..... اور طویل قانونی لڑائی..... 'گاشل کہہ رہا تھا.' .....لیکن پڑوسی ملک کے تمہارے مددگار گُر گے تو تمہیں..... تمہارے ہی گاؤں کے لوگوں کے سامنے .....تمہارے دونوں ہاتھ پشت پر.....اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر..... فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیں گے ..... تاکہ آئندہ کوئی غداری نہ کرے.....'

'تم ٹھیک کہتے ہو.....' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

'تو پھر..... مسٹر زوگو واڈی..... ایم اے اکونومکس ..... اب.....ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے..... کیا خیال ہے؟'

'کیا کرنا چاہیے؟ جلدی کرو..... ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے.....'زوگو بولا۔

'وہیں چلتے ہیں جہاں ہم ملے تھے.....اور وہی کرتے ہیں جو ہم کرنے لگے تھے..... کیوں؟'

زوگو نے کچھ دیر سوچا اور پھر گاشل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

پندرہ منٹوں میں وہ دونوں وہاں پہنچ گئے جہاں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

'گرنیڈ..... یا..... ریوالور؟' زوگو نے پوچھا۔

'میرا خیال ہے..... ریوالور مناسب رہے گا.....' گاشل نے زہریلے لہجے میں کہا'..... لاشیں قابلِ شناخت تو ہنی چاہئیں..... ورنہ آخری رسوم کی ادائیگی میں پریشانی ہوگی..... گرنیڈ سے ہونے والے چیتھڑے کون اکٹھا کرے گا.....'

ریوالوروں سمیت دونوں کے ہولسٹر وہیں پڑے تھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور جھک کر اپنا اپنا ہولسٹر اٹھا کر بیلٹ سے باندھا۔

'مسٹر زوگو واڈی..... ایم اے اکونومکس .....' لیفٹیننٹ نے پریڈ گراؤنڈ انداز میں کاشن دیا۔

'یس..... لیفٹیننٹ گاشل..... آؤ..... پہلی.....اور آخری بار ہاتھ ملا لیں.....'

دونوں نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے مصافحہ کیا پھر دونوں کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔

'یس..... زوگو واڈی..... گولی دل پر لگنی چاہیے..... سر پر نہیں..... لاش کی شکل خراب نہیں ہونی چاہیے.....'

دونوں کے ہاتھ ہولسٹر کی جانب لپکے اور اگلے ہی پل دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آئے جن کے سیفٹی کیچ وہ ہٹا چکے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے پر ریوالور تان لیے۔

'مسٹر زوگو واڈی..... ایم اے اکونومکس.....' گاشل نے چلا کر کاشن دیا'..... ون..... ٹو..... تھری.....'

دو دھماکے ہوئے اور دو لاشیں زمین پر گر گئیں۔

(لیفٹیننٹ گاشل کو بعد از مرگ بہادری کا تمغہ دیا گیا۔ زوگو واڈی کے گاؤں میں اس کا مجسمہ لگایا گیا تاکہ وہاں کے لوگوں کو تبدیلیٔ نظام کے لیے ہتھیار اٹھانے کی تحریک ملے۔)

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

روگ

مصنف: للت مگوترہ

مترجم : بلراج بخشی

اصل میں ان کا نام پشوری لال ہے لیکن اپنا ہونے کے باوجود انہیں اس نام سے پکارا جانا پسند نہیں۔ اس لئے سبھی انہیں پروفیسر پی ایل چوپڑا کے نام ہی سے جانتے ہیں۔ وہ انتہائی سوشل قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ کسی کے دکھ سکھ میں شامل ہونے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں اور اس سکھ دکھ کی وجہ بھی وہ اکثر خود ہی ہوتے ہیں۔

وہ شاذ و نادر ہی کلاس لیتے ہیں۔ انھیں طلبا اور یونیورسٹی کے متعدد مسائل کے حل سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کی مقبولیت کے حاسد دوسرے پروفیسر اکثر آپس میں ذکر کرتے رہتے ہیں کہ جب بھی پروفیسر چوپڑا کہیں باہر گئے ہوتے ہیں تو یونیورسٹی کے مسائل میں واضح کمی دکھائی دیتی ہے اور یونیورسٹی میں عموماً امن و امان ہی رہتا ہے۔ اور پروفیسر چوپڑا یہ سن کر ہنس دیتے ہیں۔

ان کے پاس طلبا کا آنا جانا ہی لگا رہتا ہے۔ خصوصی طور پر وہ طلبا لیڈر جو دوسرے اساتذہ کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہیں، پروفیسر چوپڑا کے پاؤں چھوتے ہیں اور ان سے ملنے کے لئے نہ صرف ان کے دفتر بلکہ ان کے گھر بھی جاتے ہیں۔ ان طلبا میں سے اکثریت ان کی بیٹی کے منہ بولے بھائی ہیں اور اس طرح راکھی اور بھیا دوج پر چوپڑا صاحب کے گھر میلے کا سماں بندھ جاتا ہے۔ تقریبات میں تقریر کرتے ہوئے پروفیسر چوپڑا بڑے فخریہ انداز میں اس طرح کے طلبا کی رہنمائی کرکے انھیں صحیح راستے پر ڈالنے کا سہرا اپنے سر پر باندھ لیتے ہیں۔ اپنی نگرانی میں کروائی گئی صفائی یا عطیۂ خون جیسی مہمات میں ایسے طلبا کے تعاون کا ذکر بہت شد و مد سے کرتے ہیں اور انعامات سے نوازنے کی سفارش بھی کرتے ہیں۔

یونیورسٹی میں جب بھی کوئی گڑبڑ یا ہنگامہ ہوتا ہے، انتظامیہ سب سے پہلے پروفیسر چوپڑا کو بلا بھیجتی ہے۔ پھر پروفیسر چوپڑا طلبا کے ساتھ طویل میٹنگوں کا دور شروع کرتے ہیں جن میں بٹلوہیوں کے حساب سے چائے اور ٹھنڈے مشروب پیے جاتے ہیں۔ ان میٹنگوں میں بیٹھے بیٹھے ہی اکثر پروفیسر چوپڑا وائس چانسلر کو مسئلے کے سلجھاؤ میں ہوئی پیش رفت کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ان سے مشورہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ رات دیر گئے طلبا کو وائس چانسلر کی رہائش گاہ پر لے جاتے ہیں اور ان سے وائس چانسلر کے پاؤں چھوکر معافی بھی منگوانے کے بعد وائس چانسلر سے بھی طلبا کے دو ایک مطالبے منوانے کا وعدہ کروا لیتے ہیں۔ اور اس طرح پروفیسر چوپڑا طلبا، یونیورسٹی، وائس چانسلر، یعنی سب کا بھلا کرتے ہوئے نام اور تعریف دونوں کما لیتے ہیں۔

وہ اپنی ایک عادت کو خود بھی بہت سراہتے ہیں۔ اور وہ عادت ہے علی الصباح اٹھ جانا۔ رات چاہے جتنی دیر سے سوئے ہوں، صبح ٹھیک پانچ بجے ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ لوگوں کو تو وہ یہی کہتے ہیں کہ وہ صبح صبح خدا کا نام لیتے ہیں اور پوجا پاٹھ کرتے ہیں پر اصل میں وہ گھنٹہ بھر پلنگ پر ہی پڑے رہتے ہیں اور اس ایک گھنٹے میں دن بھر میں کے بارے میں اہم فیصلے کرتے ہیں، یعنی نئے دن کا ایجنڈا طے کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو کسی یوگی کی طرح اپنے تمام حواس مرکوز کرکے سوچتے ہیں کہ کیا کوئی اور ٹیچر وائس چانسلر سے قربت تو نہیں بڑھا رہا ہے اور اگر ایسا ہو تو پروفیسر چوپڑا اسے سیدھا کرنے کی ترکیبیں تیار کرتے ہیں۔ پھر وہ ان اساتذہ کی فہرست ترتیب دیتے ہیں جنھوں نے اس بدقسمت ٹیچر کی وساطت سے وائس چانسلر کے خلاف کوئی بات کہلوائی ہے یا بات خود کرکے اس سے محض تائید کروائی ہے۔ پھر اس سلسلے کے دوسرے قدم میں و ائس چانسلر کے پاس سچی جھوٹی خبر پہنچانی ہوتی ہے کہ وہ بدقسمت ٹیچر کس طرح وائس چانسلر کے خلاف سازشیں کر رہا ہے۔ اس کے بعد صبح کی نیک ساعتوں میں کسی یوگی کی طرح پروفیسر چوپڑا کا ایک نکتے پر مرکوز دھیان اس طرف جاتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وائس چانسلر

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

کو کسی مسئلے کا سامنا کیے کافی عرصہ بیت گیا ہو۔ پروفیسر چوپڑا بخوبی واقف ہیں کہ کسی بھی وائس چانسلر کے لئے امن وسکون کا طویل دورانیہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس سے وائس چانسلر کے خطرناک ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔ لیکن اس کا بہت آسان علاج ہے۔ بس کچھ طلبا لیڈروں کو اشارہ کرنے کی ضرورت ہے، باقی یہ ہشیار اور ہونہار طلبہ لیڈر خود سنبھال لیتے ہیں۔ اور پھر آخر میں صلح کروانے اور ایجی ٹیشن رکوانے کے لئے تو پروفیسر چوپڑا کی خدمات ہی طلب کی جائیں گی۔ اور پروفیسر چوپڑا تو ایسا حل نکالتے ہیں کہ سب کا بھلا ہونا طے ہے۔

لیکن آج پروفیسر چوپڑا بڑے عذاب میں ہیں۔ ان کے پیٹ میں مروڑ پڑ رہے ہیں اور درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ رات بھر سو نہیں سکے۔ اہل خانہ ان کے پلنگ کے گرد اکٹھا ہوئے ہیں اور وہ پلنگ پر لوٹ رہے ہیں۔ تمام تر کوششوں کے بعد ڈاکٹر کو ان کی بیماری کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی مگر صرف پروفیسر چوپڑا ہی اپنے پیٹ درد کی وجہ جاننے کے باوجود بیان نہیں سکتے تھے۔

کوئی پندرہ دن قبل یونیورسٹی میں ایک حادثہ ہو گیا تھا جس کا رشتہ پروفیسر چوپڑا کے درد سے ہے۔ کچھ شہدوں نے شعبہ انگریزی کی ایک طالبہ سے سرعام چھیڑ چھاڑ کی۔ طالبہ نے وائس چانسلر کو اس کی تحریری شکایت کر دی جس نے اس سلسلے میں معمول کے مطابق ایک تفتیشی کمیٹی تشکیل کر کے پروفیسر چوپڑا کو اس کا چیئرمین بنا دیا۔ پروفیسر چوپڑا کے مطابق یہ واقعہ کسی خاص نوعیت کا حامل نہیں تھا بلکہ یونیورسٹی میں اس قسم کی باتیں ہو جاتی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ بہت جلدی اس مسئلے کا حل ڈھونڈ لیں گے پر کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ اصل میں اس واقعہ میں ملوثین طلبہ لیڈر بھی تھے اور پروفیسر چوپڑا کے شاگرد بھی۔ تفتیش کی ابتدا ہی میں پتہ چل گیا کہ اس واقعے کے چشم دید گواہ بھی ہیں جن میں شعبہ انگریزی کے کچھ طلبا اور اسی شعبے میں حال ہی میں تقرر شدہ ایک نوجوان لیکچرر ڈاکٹر وِشال شامل ہیں۔ تفتیش شروع ہوتے ہی پروفیسر نے اپنے مخصوص انداز میں بیان جاری کر دیا کہ قصورواروں کو بالکل بخشا نہیں جائے گا اور انہیں سخت

سے سخت سزا دی جائے گی تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ ادھر کچھ طلبا نے لڑکی کے گھر والوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا، لیکن گڑبڑی کرنے والے لڑکے بھی کچھ خطرناک قسم کے ہیں اور ان کے روابط بھی دور دور تک ہیں اور وہ لڑکی سے معافی مانگنے کو بھی تیار ہیں۔ اس لئے سب کے حق میں یہی ٹھیک ہو گا کہ لڑکی اپنی شکایت واپس لے لے اور معاملے کو رفع دفع کر دیا جائے۔ ورنہ لڑکی کی مزید بدنامی ہو گی کیونکہ وہ لڑکے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ رات ہی کو پروفیسر چوپڑا کو اطلاع مل گئی کہ لڑکی شکایت واپس لینے پر راضی ہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ انکوائری کمیٹی کی ایک ہی میٹنگ میں معاملہ نمٹا لیا جائے گا۔ پروفیسر چوپڑا نے رات ہی کو یہ اطلاع وائس چانسلر کے گوش گزار کر دی اور پھر پروفیسر صاحب اور وائس چانسلر صاحب آرام سے سو گئے۔ مگر یہ اطمینان طویل المدتی ثابت نہ ہو سکا۔

مگر دوسرے دن انکوائری کمیٹی کی میٹنگ میں لڑکی نے شکایت واپس نہیں لی اور اپنے بیان پر ڈٹی رہی۔ گواہوں نے بیان دیا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہوئی تھی لیکن وہ قصورواروں کی شناخت نہیں کر سکتے۔ مگر پروفیسر چوپڑا کی پریشانی تب بڑھی جب ڈاکٹر وِشال نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ قصورواروں کو اچھی طرح پہچانتا ہے اور اس نے انہیں نامزد بھی کر دیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ لڑکی تو اپنی شکایت واپس لینے پر تیار ہو گئی تھی مگر ڈاکٹر وِشال نے ہی اسے یقین دہانی کروائی کہ وہ اپنی گواہی پر قائم رہے گا اس لئے وہ بھی اپنے بیان پر قائم رہے تاکہ قصورواروں کو ان کے کیے کی سزا مل سکے۔

پروفیسر چوپڑا سمجھ گئے کہ انکوائری کچھ طول پکڑے گی مگر ہو گا وہی جو وہ چاہتے ہیں۔ ان کے پاس ڈاکٹر وِشال جیسے لوگوں کو سمجھانے اور انہیں راہ راست پر لانے کے کئی طریقے ہیں۔ پہلے کچھ ٹیچر فرداً فرداً اور پھر اکٹھے ہو کر بھی ڈاکٹر وِشال سے ملے اور اسے طلبا سے دشمنی مول نہ لینے کی نصیحت کی اور اس سلسلے میں اسے کچھ پرانے قصے بھی سنائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ٹیچر کا کام بچوں کو سزا دلوانا نہیں بلکہ ان کی اصلاح کرنا ہے خصوصاً اس وقت کہ جب وہ معافی مانگنے پر بھی تیار ہوں۔ اسی دوران ڈاکٹر

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

وِشال کے شعبے کے ارد گرد کچھ عجیب وغریب اور خطرناک قسم کے چہرے دکھائی دینے لگے۔ وہ جب بھی کسی کام سے شعبے سے باہر نکلتا کچھ خطرناک دکھائی دینے والی آنکھیں اسے گھورتی رہتیں۔ لیکن انکوائری کمیٹی کی اگلی میٹنگ میں بھی وِشال اپنے موقف پر قائم رہا۔

اب تک پروفیسر چوپڑا کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے تھے۔ لیکن اب بھی انہیں اپنے نسخے پر یقین تھا۔ ایک دن وائس چانسلر نے بھی ڈاکٹر وِشال کو اپنے چیمبر میں بلا بھیجا اور اسے خوشخبری سنائی کہ فرانس میں ہونے والی کانفرنس میں شرکت کے لئے اس کی دی ہوئی عرضی کو منظور کر لیا گیا ہے حالانکہ کچھ سینئر اساتذہ نے بھی اس کے لئے درخواستیں دی ہوئی تھیں۔ زیادہ نہ کہتے ہوئے وائس چانسلر نے یہی کہنے پر اکتفا کیا کہ وہ ڈاکٹر وِشال جیسے ہونہار ٹیچر سے امید رکھتے ہیں کہ وہ یونیورسٹی میں امن وسکون برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوگا اور ایسی کسی بات سے گریز کرے گا جس سے یونیورسٹی کے نام پر حرف آئے یا اخباروں میں منفی قسم کی خبریں شائع ہوں۔

انکوائری کمیٹی کی اگلی میٹنگ کے بعد چوپڑا کا پیٹ درد خطرناک شکل اختیار کر گیا کیونکہ ڈاکٹر وِشال اپنی پہلی بات پر قائم رہا۔ پھر پروفیسر چوپڑا نے پیٹ میں اٹھتی درد کی ٹیسوں اور دکھی دل کے ساتھ آخری حربہ آزمانے کا تہیہ کر لیا۔

پرسوں شام کو گھر واپس آتے ہوئے ڈاکٹر وِشال کے اسکوٹر کو روک کر کچھ غیر مانوس لوگوں نے لوہے کی راڈوں اور ہاکیوں کے ساتھ اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن اگلے دن پروفیسر چوپڑا کے پیٹ کا درد اپنی تمام حدیں پار کر گیا جب اس نے اخبار میں پلستر چڑھے بازوؤں، زخمی سر پر لپٹی ہوئی پٹیوں کے ساتھ اسپتال کے بستر پر پڑے ڈاکٹر وِشال کی تصویر کے ساتھ اس کا یہ بیان پڑھا کہ اگر کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس حملے سے ڈر کر وہ یونیورسٹی والے معاملے میں اپنا موقف بدل دے گا تو وہ غلط فہمی میں ہیں۔ اس نے نامہ نگار کو یہ بھی بتایا کہ حملہ آور غنڈوں کے خلاف اس نے پولیس میں ایف آئی آر درج کروادی ہے۔

پروفیسر چوپڑا کو اپنی زندگی کے وہ تمام اصول منہدم ہوتے نظر آئے جو ان کی نظر میں صداقتِ کُل تھے اور جن پر چل کر انہوں نے اپنی زندگی میں اس قدر کامیابی حاصل کی تھی۔

اس کے بعد تو پیٹ کے درد نے پروفیسر چوپڑا کو شکست خوردہ ہی کر دیا۔ ایک تو ان کے تمام نسخے ناکام ہو گئے ہیں، اور دوسری سمجھ میں نہ آنے والی تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص بلا خوف و ڈر، ذاتی فائدے اور مطلب کے بغیر سچ بول کر جان دینے کو بھی تیار ہو جائے۔ ضرور اس میں کوئی راز ہے۔ وہ یہ سوچ کر انتہائی بے چین تھے کہ یہ انہونی کیسے ہو سکتی ہے۔

اسی سوال کی زائیدہ بے چینی نے پیٹ میں اٹھنے والے مروڑ کی بڑھتی ہوئی شدت کے ناقابلِ برداشت درد کی ٹیسوں کا گرداب چلا دیا۔

☆☆☆

وہ دن کھو گئے وہ زمانے گئے
نئے لوگ آئے پرانے گئے

بچھڑنے کا جب فیصلہ ہو گیا
تو ملنے کے سارے بہانے گئے

نئی بستی کا نقشہ بننے لگا
پرندوں کے پھر آشیانے گئے

بہت دیر دیکھا کیے ہم انہیں
بہت دور ان کو منانے گئے

غنیمت ہے بلراج سر بچ گیا
مگر بوجھ سے میرے شانے گئے

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

مالتو

مصنف: جگدیپ دُوبے

مترجم: بلراج بخشی

ٹُوٹے ہوئے فرش پر پڑے سرخ دھبوں کو پونچھے سے زورزور سے رگڑتے ہوئے اس نے سوچا 'کیسا لہو ہے میرا، جہاں پڑتا ہے وہیں جم جاتا ہے.... لاکھ کوششیں کر رہی ہوں پھر بھی فرش کو چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا.... ویسے بھی سردیوں میں سب کچھ جم جاتا ہے.... اور پھر ہمارے رشتے پر سے تو سردی کبھی ختم ہی نہیں ہوئی ...... لکڑیوں کی گرمی دینے کی ہر کوشش بھی رائیگاں ہی گئی ...... بس دھواں پھیلا اور سیاہی چھائی رہی ..... آنکھوں میں بسا ہوا دھواں گیا نہیں اور آنکھوں کا پانی کبھی خشک ہوا نہیں....'

پاس ہی رکھے ٹین کے ٹکڑے کے ساتھ رگڑ کر خون کے دھبوں کو نکالنے کی کوشش کرتی رہی۔ کھڑ کھڑ کی آواز سن کر کھاٹ پر سویا اس کا شوہر جھنجلا کر چلایا:

'آدھی رات کو یہ کیا رگڑ رہی ہو؟'

'تم نہیں جاگو گے تو کیا صبح نہیں ہوگی.... آنکھیں بند کر کے دن کو رات نہ سمجھو....' مالتو بولی۔

'رضائی کے سارے نگندے اُدھڑ گئے ہیں اور روئی جگہ جگہ اکٹھی ہوگئی ہے.... ٹھنڈ ہے کہ رکتی ہی نہیں....' اس کے شوہر نے پھٹے لحاف کو پیروں سے اوپر کھینچتے ہوئے کہا۔

'قصور رضائی کا نہیں تمہارا ہے.... تم نے ہی پیر ٹھوک ٹھوک کر نگندے توڑ دیئے.... رُوئی بیچاری کیا کرتی.... اس کی حد تو پڑے کے اندر ہی ہے نا.... بیچاری کسی نگندے کے سہارے اکٹھی ہو کر کہیں بیٹھ جاتی ہوگی....' مالتو نے جواب دیا اور پونچھن کو زور سے نچوڑ کر اس سے نچڑتے پانی کے قطروں کو فرش پر جمے ہوئے خون کے دھبوں پر گراتے ہوئے سوچنے لگی کہ اگر اسے بھی نچوڑا جائے تو اس میں سے بھی اسی طرح رک رک کر ہی خون کے قطرات ٹپکیں گے۔ اس کے جسم میں لہو بننے کا سلسلہ تو کب کا ختم ہو چکا ہے، اس نے سوچا اور جمے ہوئے خون کے دھبوں کو ٹین کے ٹکڑے کے ساتھ پھر سے اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگی جیسے اپنا ہی سراغ مٹانا چاہ رہی ہو۔ شاید صبح ہونے سے پہلے وہ صبح ہی کی طرح صاف ستھری، نئی اور تر و تازہ ہونا چاہتی تھی، چاہے پھر تمام دن ماحول میں بسی ہوئی پراگندگی سے بچ سکنے کے امکانات ہی نہ ہوں۔

رضائی کو اپنے گرد کس کر لپیٹتے ہوئے اس کا شوہر پھر زور سے چلایا:

'سونے دوگی یا نہیں...... کتنا اندھیرا ہے ابھی.....'۔

'سردیوں میں روشنی دیر سے ہوتی ہے اور اندھیرا جلدی گھر آتا ہے...... جب سورج کا سفر کم ہو جاتا ہے تو گرمی کی جگہ سردی آنے لگتی ہے...... یہی سلسلہ چل رہا ہے صدیوں سے......' مالتو نے کہا۔

'چار لفظ کیا پڑھ لیے ہیں کہ باتیں ہی سناتی رہتی ہو ...... آخر کر کیا رہی ہو؟' اس کے شوہر نے پوچھا۔

'رات کو جب تُو نے تھپڑ مارا تھا نا...... تو میرا کمزور جسم طاقت ور خون کو اندر نہ روک سکا...... کچھ قطرے فرش پر گر گئے تھے...... انہیں مٹانے کی کوشش کر رہی ہوں ...... کوئی آ گیا تو کیا دیکھے گا ...... پتہ تو سب کو ہے...... پھر بھی...... اپنے ساتھ ساتھ ان کے سچ کو بھی جھوٹ کا غلاف پہنا رہی ہوں ...... جیسے پیتل کے برتنوں پر قلعی چڑھاتے تھے کسی زمانے میں...... تاکہ کھانے میں پیتل کا کساؤ نہ آجائے ...... کساؤ لگ جانے سے سب کچھ کسیلا ہو جاتا ہے......'

اس کے شوہر نے چارپائی سے اس طرح تڑپ کر نیچے چھلانگ لگائی جیسے کسی دھماکے کی آواز سے درخت پر بیٹھے پرندے اڑ جاتے ہیں۔

'میں نے رات کو پھر تجھے مارا تھا کیا؟...... بچوں کی قسم، مجھے کچھ یاد نہیں......' اس نے حیرت سے پوچھا۔

وہ جب بھی مالتو پر ہاتھ اٹھاتا، اگلی صبح بس اسی طرح معصوم بننے کی کوشش کرتا۔ اور اپنے گرتے ہوئے گھونسلے کے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بکھرے ہوئے تنکوں کو چننے کے لئے موسم کی مناسبت سے مالتو کچھ پنکھ پھڑ پھڑا لیتی، مگر آج وہ کہنے لگی:

'میں نے شادی تو ایک آدمی سے کی تھی.....مگر یہاں مجھے کئیوں کے ساتھ بھگتنا پڑتا ہے......اس کی اصلی شکل تو میں نے دیکھی ہی نہیں.....گھڑی میں کچھ کا کچھ بن جاتا ہے.....اگلی گھڑی میں کچھ اور......پھر کچھ اور......'۔

مالتو کے شوہر کی حالت ڈرامے کے اس کردار کی طرح ہو گئی جو اسٹیج پر آتے ہی اپنا پارٹ بھول جائے۔ اس صورت میں اس کے لئے اسٹیج پر بنے رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور وہاں سے ہٹنا اور بھی مشکل۔ اور لوگ اس کی سراسیمگی کو اس کے گونگے بہرے ہونے کی اداکاری سمجھ کر تالیاں بجانے لگتے ہیں۔

مالتو کے کانوں میں بھی تالیاں گونجتیں اور آنکھوں کے سامنے پرچھائیاں تیرنے لگتیں۔ جانے کیوں آج مالتو تنکوں کی تلاش میں نہیں اُڑی اور اس کے پنکھ اسے آسمان پر نہیں لے گئے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹین کے ٹکڑے کو دور پھینکا اور اس کے نیچے گرنے سے ہونے والی آواز کی دھماکے سے خود ہی کانپ گئی۔ جب کوئی گہری سوچوں میں ڈوبا ہو تو کوئی بار کسی ہلکی سی آواز کی بازگشت بھی اس کے دل و دماغ کی خلا میں دیر تک گونجتی رہتی ہے۔ اب مالتو بلا آواز ہی خون کے دھبے صاف کرنے لگی۔ گہرا پانی بے آواز ہو کر بھی خاصا پُر رفتار ہوتا ہے۔

مالتو کے شوہر نے اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور پھر ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگنے لگا۔ پونچھن والی ٹوٹی ہوئی بالٹی کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے مالتو نے پوچھا:

'ہاتھ جوڑ کر پچھلے گناہوں کی معافی مانگ رہے ہو یا .....آئندہ کیے جانے والے گناہوں کی اجازت لے رہے ہو؟'

'بات تو سنو......کہاں جا رہی ہو؟'

'خون والے پانی کا پونچھن سب جگہ تو نہیں پھیروں گی......پانی بدل کے لاؤں......تاکہ ادھر کی خبر ادھر نہ جائے بدنامی ہوتی ہے......اور......کئی بار بدنامی بھی بغاوت کو جنم دیتی ہے......'

'تم بغاوت کرو گی؟......میرے خلاف؟' اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

'ظلم کی انتہا کے بعد بھی جو بغاوت نہ کرے، وہ نہ تو انسان ہے، نہ جانور......اور نہ ہی مشین......کیوں کہ یہ سب بغاوت کرتے ہیں......دسویں جماعت میں ہمارے ہندی کے ماسٹر جی ہمیں یہ باتیں پڑھاتے تھے......تب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا......تب آسمان کو چھو لینے کی بھی ہمت تھی......اب سب کچھ سمجھ میں آتا ہے......لیکن بس......صرف سمجھ میں ہی آتا ہے......'۔ ایک طویل سانس لے کر وہ باہر نکل گئی۔ اس کے شوہر نے اس کی تقلید کی۔

'تو تمہیں ماسٹر جی نے بغاوت سکھائی؟'

مالتو نے میلا پانی باہر پھینکا لیکن ساتھ ہی بالٹی بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور فرش سے بالٹی کے ٹکرانے کی آواز اسے یوں لگی جیسے چھڑی سے پیٹے جانے پر کتے کا پلا چل بل چل بل کرنے لگتا ہے۔ بالٹی پر اسے اپنا ہی گمان ہوا۔ اس نے فوراً پہلے بالٹی اور پھر اس سے الگ ہو چکی ہتھی کو اٹھایا جیسے وہ اپنی ہی بکھری ہوئی زندگی کو اکٹھا کر رہی ہو۔ مگر درخت سے گرے ہوئے پھولوں، پتوں یا پھلوں کو انسان چن تو سکتا ہے، انہیں درخت کے ساتھ واپس جوڑ نہیں سکتا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ٹوٹ جانے پر وہ درخت بھی انہیں قبول نہیں کرتا اور جو کچھ بھی پرانا تھا اس سے دست کش ہو کر نئے پھول پتے بنانے کے سلسلے میں مصروف ہو جاتا ہے، ویسے ہی جیسے جاندار اپنے فضلے سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ مالتو نے ہتھی کو بالٹی سے جوڑا، پھر ٹوٹے ہوئے مگ کے ساتھ ٹوٹے ہوئے ڈرم میں سے پانی نکال کر بالٹی میں ڈالا اور اندر لے گئی۔ اس کا شوہر بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے پوچھا:

'تمہارے ماسٹر جی اور کیا کہتے تھے؟'

'یہی کہ......دنیا کی ہر چیز میں بغاوت کا بیج ہوتا ہے جو وقت اور حالات کی گرمی کے ساتھ پھوٹ کر پہلے ننھا پودا اور پھر بڑا درخت بن جاتا ہے......اگر وہ بیج نہ پھوٹے تو انسان کو بھی بس برائیلر انڈے جیسا ہی سمجھو......جس سے بچہ نہیں نکل

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

سکتا......'۔ یہ کہہ کر مالتو نے چارپائی پر بچھا ہوا بستر سمیٹ کر اسے تہ کر کے رکھا اور چارپائی کو صحن میں دیوار کے ساتھ ایک جانب کھڑا کر دیا۔

'آج بچے اسکول نہیں جائیں گے کیا؟' موضوع بدلتے ہوئے مالتو کے شوہر نے پوچھا۔

مالتو نے اسے غور سے دیکھا۔

'اتوار کو بھی اسکول بھیجو گے انہیں.... پہلے تو کبھی نہیں پوچھا......'۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولا:

'تیری بھی چھٹی ہے؟'

'میری چھٹی ہوئی تو سارے گھر کی چھٹی ہو جائے گی......' مالتو نے تلخ ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ '......میں کوئی سرکاری نوکر تو ہوں نہیں......جس دن سرکاری چھٹی ہوتی ہے اس دن مجھے جھاڑ پونچھ کر کے سارے گھر کو چمکانا ہوتا ہے......سارا کوڑا باہر نکالنا ہوتا ہے......اور اگر ایک گھر میں زیادہ وقت لگ جائے تو دوسرے گھر میں جاتے ہی سب سے پہلے جھڑکیں کھانا پڑتی ہیں......'۔

مالتو کے شوہر کو لگا جیسے اسے سردی میں بھی پسینہ چھوٹ رہا ہے۔ اسے یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ موسم کا اثر تھا یا اس پر شرم حاوی ہو رہی تھی حالانکہ آج تک اس نے خود پر شرم کو حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ اپنا دھیان بٹانے کے لئے اس نے بیڑی سلگائی۔

مالتو کوئی دس گھروں میں کام کرتی تھی۔ ہر روز کم سے کم چالیس چھوٹے بڑے لوگوں کی باتیں سنتی۔ کسی کے کپڑے ٹھیک سے نہیں دھلے، کہیں برتنوں میں چکنائی رہ گئی، کہیں جھاڑ پونچھ ٹھیک نہیں ہوئی، یا جھاڑو دیتے وقت کہیں کوڑا رہ گیا۔ دل کو تو کبھی نقاب نہیں پہنایا جا سکتا مگر چہرے پر ڈھٹائی کا، یا مصنوعی پھولوں کا نقاب اوڑھنا ہی پڑتا ہے۔

باورچی خانے کی جانب جاتے ہوئے دیکھ کر اس کے شوہر نے:

'اب صبح صبح جگا ہی دیا ہے تو چائے کا گھونٹ ہی پلا دو......'۔

'دیسی چائے کا قہوہ ابال کر رکھ دیا ہے...... پر دودھ دکان سے لانا پڑے گا......اور اگر قہوہ پینا ہے تو خود گرم کر لو......'۔ مالتو نے جواب دیا۔

'میں نے کتنی بار کہا ہے کہ ایک کلو دودھ کی لاگ لگا ہی لو......تم مانتی ہی نہیں......'۔

'تم نے تو شادی کے پھیروں میں کیا ہوا اپنا بچن بھی بھلا دیا ہے کہ...... پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤں گا...... مجھے روٹی کمانی بھی پڑتی ہے اور پکانی بھی......'۔

'رات کو بھی تم نے کچھ ایسی ہی بات کی تھی کیا؟' شوہر نے پوچھا۔

'میں نے کہا تھا کہ اگر گھر کا خرچ تم سنبھال لو تو مجھے لوگوں کے گھر پر کام کرنے سے چھٹی مل جائے...... پیٹ میں روٹی اور جسم پر کپڑا......بس اتنی سی ضرورت ہے میری، پیٹ آدھا خالی رہے تو بھی گزارہ ہو جائے گا ...... پر گھر گھر جھانکنا، لوگوں کی اُترن پہننا، ان کی جوٹھن کھانا......ویسا ہی ہے جیسے پیاس بجھانے کے لئے سمندر کا نمکین پانی پینا......'

'کام کرنا کوئی گناہ تو نہیں ......اور پھر تم جسم تو نہیں بیچ رہی ہو......'۔ اس کے شوہر نے کچھ جھنجھلا کر کہا۔

مالتو سکتے میں آ گئی۔ جیسے آسمان میں ہوا جم گئی ہو، پرندوں کے پروں میں لچک ختم ہو گئی ہو اور چھوٹا سا آسمان لامحدود ہو گیا ہو۔ مگر خاموش رہنا اپنے وجود کو مٹا دینے کے مترادف تھا۔ وہ پھٹ پڑی:

'جسم تو نہیں بیچتی مگر روز اپنے آپ کو بازار کا سودا ضرور محسوس کرتی ہوں...... قیمت بھی لگتی رہتی ہے...... بزرگ کہتے ہیں کہ جب کسی چیز کی قیمت پڑ جائے تو وہ بچ نہیں سکتی...... لوگوں کی نظروں اور باتوں سے جسم اور دل پر نیل ضرور پڑ جاتے ہیں......'۔ مزید کچھ کہنا بے کار سمجھ کر مالتو اندر چلی گئی کیوں کہ اسے پتہ تھا کہ اس زمین پر کبھی نمی نہیں آئے گی۔

'تم کن نیلوں کی بات کر رہی ہو...... مجھے تو کبھی نظر نہیں آئے......'۔ مالتو کے شوہر نے بلند آواز میں پوچھا۔ اور خاموش رہا جیسے کچھ دیر کے لئے سورج کے سامنے بادل کا ٹکڑا

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

آ گیا ہو مگر اس کے کان مالتو ہی کی طرف لگے تھے کہ وہ کیا کہتی ہے۔ مالتو میلے کپڑے لے کر باہر آئی، انہیں بالٹی میں ڈالا اور بولی:

’تمہیں نیل نظر آجاتے تو پڑتے ہی کیوں؟‘ اس نے صحن میں کھڑے ہو کر آسمان کی جانب دیکھا۔ تھوڑی تھوڑی روشنی پھیل رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے بولی’...سردی کے موسم میں روشنی بھی آتے آتے ہی آتی ہے.....‘۔ پھر اس نے شوہر کو مخاطب کیا:

’چھلکے بنا کر رکھ دیئے ہیں ..... چھلکے پر آچار کی پھانک رکھ کر بچوں کو دے دینا......اور ساتھ میں چائے بھی...... دودھ کے لئے دس روپے رکھ دیئے ہیں، پوجا کی تختی پر......‘ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ’کہیں بیڑی کا بنڈل ہی نہ اٹھالانا...... کہ بچوں کو قہوہ ہی پینا پڑے......‘

مگر وہ کمرے میں جا چکا تھا۔

مالتو ٹوٹے ہوئے ڈرم کے پاس پیروں کے بل بیٹھ کر وہاں رکھے قدرے چوڑے پتھر پر کپڑے دھونے لگی۔ ٹھنڈے پانی سے تو اس کی دوستی تھی اور اسی لئے اس کے ہاتھ بھی ٹھنڈے نہیں ہوتے تھے۔ ٹھنڈا پانی جب بھی اس کے ہاتھوں سے مس ہوتا، اپنی ٹھنڈک چھپا کر ہی ملتا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی بار اپنے شوہر کو شراب چھوڑنے اور دہاڑی لگانے کے لئے کہہ چکی تھی، پر جب تک اس کے پاس شام کے لئے کوئی انتظام ہوتا اس کے ذہن میں کام کا خیال ہی نہ آتا۔

مالتو نے جب بھی اس سے کہا۔ ’تم گھر میں جو بھی تھوڑا بہت لاؤ گے میں اسی میں گزارہ کرلوں گی...... میں گھر میں ہی رہنا چاہتی ہوں......‘

تو وہ کہتا:

’تم پنجرے میں قید ہونے کی بات کر رہی ہو...... پرندے کی طرح آسمان پر اڑنا اچھا نہیں لگتا؟‘

اور مالتو کا جواب ہوتا:

’کسی نے پرندے سے بھی پوچھا کہ آسمان پر کیا کیا ہے؟ اپنے بدن کے ایک ایک کونے کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ کوے، چیلیں، باز اپنی تیز چونچیں لئے اڑتے رہتے ہیں۔ کسی کے چھونے پر چپ رہو تو پریشانی، اور بولو تو بھی پریشانی۔

اس کی موگری میلے کپڑوں پر چل رہی تھی اور آہستہ آہستہ میل بھی نکلتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ خود بھی تو وقت کی موگری کی مار سہتی جا رہی تھی مگر اس کی میل ایسی چپک گئی تھی کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ گھسیارے کے بیٹے نے گھاس ہی کاٹنی ہوتی ہے، اور پھولوں کے پیڑوں پر پھول ہی لگتے ہیں، غریبی میں سے غریبی ہی جنم لیتی ہے۔ جوں جوں کپڑوں پر موگری کی مار پڑتی رہی توں توں اس کے دل میں بھانت بھانت کے خیال آتے رہے، جو چھینٹوں کی طرح ادھر ادھر چھٹک جاتے تھے۔

طلوع آفتاب کی پہلی شعائیں جیسے اسی انتظار میں تھیں کہ جوں ہی کپڑے دھونے کا کام ختم ہو، وہ ڈیوڑھی کی درزوں سے اندر در آئیں۔ مالتو نے گیلے کپڑے الگنی پر پھیلائے اور ڈیوڑھی کھول کر مکمل آفتاب کا استقبال کیا۔ اس کا سفر بھی اسے اپنے جیسا ہی لگتا تھا۔ وہ پہاڑ کے پیچھے سے طلوع ہوتا اور مالتو اپنی ڈیوڑھی سے نمودار ہوتی اور سردیوں میں تو دونوں کی ملاقات یہیں ہوتی۔ پھر وہ دونوں اپنی اپنی بے مقصد دوڑ میں لگ جاتے۔ سورج بے چارہ دن بھر کی تھکان کے بعد شام تک اپنا سنہرا پن گنوا کر سرخ ہو گیا ہوتا اور اپنی حالت اور سمت بدل کر پہاڑوں کے پیچھے چھپ کر زمین پر اندھیرا کر دیتا، اور اسی اندھیرے میں تھکی ماندی مالتو بھی لڑکھڑاتی ہوئی اپنی ڈیوڑھی کو ٹٹولتی ہوئی گھر میں داخل ہوتی۔ وہ سوچتی کہ پہاڑوں کے پیچھے کہیں سورج آرام کر رہا ہوگا لیکن اس کا سفر ابھی باقی ہے۔ ابھی تو شام ہی ڈھلی ہے اور اسے تو شب کی تاریکی سے نمٹنا بھی ہے اور پھر صبح ہوتے ہی دوڑنا بھی ہے۔

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

ڈوگری پر عربی اور فارسی کے اثرات

■ بلراج بخشی

ایک خیال کے مطابق جموں خطے میں دو جھیلوں: مانسر اور سروئیں سر کی مناسبت سے اسے دوی گرت (دو گڑھوں والا) کہا جاتا تھا جو بگڑ کر ڈُگر بن گیا۔ جارج گریرسن نے 'ڈُگر' کی اصطلاح کو راجستھانی لفظ 'ڈونگیر' سے تعبیر کیا جس کا مطلب 'پہاڑی' ہے۔ ایک اور خیال کے مطابق لفظ 'دُرگر' کو بھی ڈُگر کا ماخذ بتایا گیا ہے جس کے معنی ہیں 'نا قابلِ تسخیر'۔

دھاروار کرناٹک میں 1976ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے لسانی اجلاس میں دوی گرت اور ڈُگر میں تعلق پر اتفاق نہ ہو سکا مگر ڈونگیر اور ڈُگر میں تعلق پر اتفاق کر لیا گیا۔ 1982ء میں جے پور میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کی ایک اور نشست میں راجستھان میں ڈُگر اور ڈوگرا الفاظ کی موجودگی کا اعتراف کیا گیا۔ اور گریرسن کے خیال کی تائید کی گئی کہ ساتویں آٹھویں صدی عیسوی میں کہیں پنجاب اور راجستھان سے ہجرت کر کے راجپوت (لیکن لفظ راجپوت ان دنوں رائج ہی نہیں تھا) جموں کی پہاڑیوں میں بسنے لگے اور ڈوگرا کہلائے۔

ڈوگری دراصل ہند یوروپی اور ہندی، اردو، پنجابی، مراٹھی، اوڑیہ، اور بنگالی جیسی کئی زبانوں کی ہم قبیل ہند آریائی لسانی خاندان کی زبان ہے جو ریاست جموں وکشمیر کے جموں خطے میں اور شمالی پنجاب کے کچھ حصے میں بولی جاتی ہے۔ کسی زمانے میں یہ ٹاکری رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ دسویں صدی عیسوی میں گرمکھی (پنجابی) بھی ٹاکری ہی سے نکلی بتائی جاتی ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی میں چمبہ میں تانبے کی تختیوں پر لفظ 'دُرگر' کا اولین تذکرہ ملتا ہے جس میں دریائے راوی اور چناب کے بیچ کے خطے کو ڈوگروں کی سرزمین بتایا ہے۔ 1317ء میں فارسی اور ہندوی کے مشہور شاعر امیر خسرو نے بھی ڈوگری کا ذکر کیا ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زبان کے طور پر ڈوگری پہلے سے رائج تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل تک عیسائی تبلیغی لٹریچر سمیت ڈوگری میں کئی دستاویزات ملتی ہیں۔ جموں کے ڈوگرا آرٹ میوزیم میں ڈوگری رسم الخط میں ایک تحریر کندہ ہے جسے ابھی تک سمجھا نہیں جا سکا۔ دیوی بھگوتی مندر مہانپور (جموں) میں 1526ء کی ایک تحریر ٹاکری رسم الخط میں کھدی ہے۔ چمبہ، منکوٹ اور بسوہلی کے مصوری کے نمونوں پر بھی ٹاکری رسم الخط میں تحریریں ملتی ہیں۔ سری رامپور کے عیسائی مبلغین کی جانب سے کروایا گیا بائبل کا ترجمہ ملا ہے جسے دیوناگری رسم الخط میں چھپی ہوئی ڈوگری کی پہلی کتاب تسلیم کیا گیا ہے۔ حالانکہ چودھویں پندرھویں صدیوں عیسوی میں ڈوگرا راجاؤں کی کچھ درباری تحریریں ٹاکری میں دستیاب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے لیکن ادبی کام سنسکرت، فارسی یا برج بھاشا ہی میں ہوتا تھا۔

دراصل ڈوگری میں ادبی سرگرمی ٹہل داس سے شروع ہوتی ہے۔ جس نے بن مالی داس مخلص پوری عُرف بلی رام گوسائیں کی، اورنگ زیب کی تخت نشینی سے بہت پہلے کی، لکھی گئی ایک طبع زاد فارسی تصنیف 'راجاولی' کا 87-1786ء میں ڈوگری میں ترجمہ کیا اور اس کا عنوان 'رجولی' رکھا۔ جموں کے راجہ رنجیت دیو کے عہد میں برج بھاشا کا شاعر، دتُّو، ڈوگری میں بھی شعر کہتا تھا جس کے اب صرف دو ہی گیت دستیاب ہیں۔ اس دور میں ڈُگر کی درباری زبان ڈوگری ہی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں بھی درباری زبان ڈوگری ہی رہی جسے تب ٹاکری کی ایک ترقی یافتہ شکل 'ڈوگرے اکھر' میں لکھا جانے لگا تھا۔

1890ء میں انگریزوں نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو معزول کر کے ان کے اختیارات ایک کمیشن کو تفویض کر دیئے۔ اس کمیشن کا ایک ممبر پنجاب کا بھاگ رام تھا جو اُردو کا خیر خواہ تھا۔ جموں کے صحافی اور سابق راجیہ سبھا ممبر دھرم چند پرشانت کے مطابق بھاگ رام کی زوردار ڈوگری مخالف مہم ہی کا نتیجہ تھا کہ ڈوگری کی جگہ اردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنا دیا گیا جس کے شاخسانے میں تقریباً تین سو ڈوگرا سرکاری ملازمین کو سبکدوش ہونا پڑا۔ لیکن دھرم چند پرشانت کا یہ خیال یکسر غلط ہے۔ واضح رہے کہ شمالی ہندوستان کی طرز پر جموں وکشمیر کی درباری زبان بھی فارسی ہی تھی۔ مغلوں کے زوال کے بعد برطانوی ہند حکومت کی عملداری

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

میں فارسی کی جگہ تیزی سے مقامی زبان اردو لے رہی تھی اور صوبہ جموں وکشمیر چونکہ انگریزوں ہی کی سرپرستی میں تھا اس لیے اردو کو اپنانے کے سوا یہاں کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

چنانچہ برطانوی حکومت ہند کی جانب سے تشکیل کیے گئے لینگویج سروے کمیشن کے چیئرمین سرجارج گریرسن نے 1921ء میں جموں کے غیر ڈوگرا افسروں سے مل کر یہاں کی لسانی صورتحال کا جائزہ لیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر وولنر بھی ڈوگری کو پنجابی ہی کی بولی سمجھتے تھے۔ یہ کتنی حیرتناک مگر تلخ حقیقت ہے کہ اس دور میں کیا جموں میں کوئی بھی بااثر یا بارسوخ اور باخبر ڈوگرا نہیں تھا جو گریرسن کو اصل صورتحال سے آگاہ کرتا؟ یا پھر جموں والے زبان کی اہمیت سے آگاہ ہی نہیں تھے؟ چنانچہ اسے اہلِ جموں کی غیر دانشمندانہ روش کا شاخسانہ کیوں نہ کہا جائے کہ جارج گریرسن نے ڈوگری کو پنجابی کی ایک ذیلی زبان قرار دے کر شوالک کی پہاڑیوں میں بولی جانے والی قدیم زبان ڈوگری کو پہاڑی کہہ دیا۔

1114ء میں بھاسکر آچاریہ کی لکھی گئی سنسکرت تالیف 'لیلاوتی' کو ودیا بلاس پریس جموں نے 1873ء میں مترجم کیا تھا۔ یہ ترجمہ جموں پاٹھ شالہ کے پرنسپل جیوتشی بشیشور نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کی جانب سے اصلاح شدہ نئے ٹاکری رسم الخط میں کیا تھا۔ لیکن لیلاوتی کے اس ترجمے کی زبان کسی بھی لحاظ سے ڈوگری نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ اسے سنسکرت، ہندی اور پنجابی کا ملغوبہ کہا جاسکتا ہے۔ تو کیا مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ڈوگری زبان کی معیار بندی نہیں ہوئی تھی اور کیا یہاں ڈوگری داں موجود نہیں تھے؟ دراصل جموں میں کم سے کم اس دور میں دانشورانہ روایت کی مثال عنقا ہی ہے۔ اسی دور میں یہاں ایک عسکری ہدایت نامہ بھی ڈوگری میں مترجم کیا گیا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں 'ڈوگرا متر' کے عنوان سے 1890ء میں ایک اخبار بھی جاری کیا گیا۔ لیکن اسی دوران ڈوگری کی جگہ اردو نے لے لی اور نہ صرف ڈوگری بلکہ ٹاکری رسم الخط کے بڑھنے کے امکانات تو قطعی مسدود ہو گئے۔ بہر حال 1952ء تک یہی حالت رہی۔ اور پھر جا کر ڈاکٹر سدھیشور ورما نے دہلی سے ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ڈوگری جریدے ''نمی چیتنا'' میں ڈوگری کو ایک باقاعدہ زبان کے طور پر بحال کرنے کی مہم شروع کی۔ یہاں یہ واضح رہے کہ نہ صرف ٹہل داس کی رجولی بلکہ اور بہت ساری کتابیں ناگری میں شائع ہوتی رہیں۔ اور تو اور دتو بھی دیوناگری ہی میں شعر کہتا تھا۔ اور پھر 1934ء میں شریمد بھگوت گیتا کے دیوناگری رسم الخط میں ترجمے کے ساتھ ہی ڈوگری کو دیوناگری میں لکھنے کا باقاعدہ چلن تو شروع ہو چکا تھا لیکن آزادی کے بعد ٹاکری سے قطعی نابلد ڈوگری قلمکاروں کے پاس دیوناگری کا کوئی متبادل تھا ہی نہیں۔ اور اب ڈوگری دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور پاکستان کے زیر انتظام جموں وکشمیر میں اسے فارسی رسم الخط ہی میں لکھا جاتا ہے۔

2 اگست 1969ء کو ساہتیہ اکادمی کی مجلس عاملہ نے ڈوگری کو ایک خود مختار ادبی زبان قرار دے دیا اور پھر 22 دسمبر 2003ء کو ڈوگری آئین کے آٹھویں شیڈیول میں شامل کر لی گئی۔

آریاؤں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی زبانوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ۱) مُنڈا گروپ Austro-Asiatic (2 چینی تبتی گروپ Sino-Tibetan ہمالیائی خطے کی زبانیں۔ 3) دروڑ گروپ Dravidian۔ آریاؤں کے آنے کے بعد ان کی ویدک بھاشا مقامی زبانوں کے آمیزش سے کئی پراکرتیں نکلیں اور یہ عمل 600 ق م تک مکمل ہو گیا بتایا جاتا ہے۔ شمالی ہند کی بیشتر زبانیں اسی پراکرت سے نکلتی رہیں، ڈوگری بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں اپ بھرنشوں کا چھ سات سو سالہ دور آتا ہے۔ اسکینڈی نیویائی علاقے سے نکلنے والے آریاؤں کا ایک ٹولہ ایران جانے سے پہلے ترکستان میں بھی کچھ دیر رہا۔ لیکن دوسرا ہندوکش پار کر کے ہندوستان میں جب آیا تو یہاں متذکرہ بالا زبانوں کے تین گروپ تھے۔ چونکہ آریاؤں کے آنے کے بعد ہمیں ان کی زبان کا کوئی ثبوت یا نام نہیں ملتا اس لیے اس دور کے اکلوتے لٹریچر ویدوں کے حوالے سے ہمارے پاس اس زبان کو ویدک کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہند آریائی زبانوں کی بات کی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک طویل عرصہ تک مقامی زبانوں کے ساتھ ویدک زبان کے تملغم کے نتیجے میں ہر خطے میں الگ الگ پراکرتیں وجود میں آتی گئیں جن سے کئی اپ بھرنشیں نکلیں۔ اور پھر بارہویں تیرہویں صدی عیسوی میں اپ بھرنشوں سے ماڈرن انڈین لینگویج

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

نکلنے لگیں۔ ویدک سے لے کر جدید ہندوستانی زبانوں کے ارتقا کے چار مراحل کو سیڑھی کہا جاتا ہے، لیکن ہندوستان کے ایک ماہر لسانیات آچاریہ کشوری لعل واجپئی 'سیڑھی' کے تصور کو مسترد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جبکہ پراکرتوں میں تو لٹریچر ملتا ہے پر اپ بھرنشوں کے گروپ کی کسی بھی زبان کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ ان کا کہنا ہے کہ اپ بھرنشوں کا مفروضہ خواہ مخواہ coin کیا گیا ہے۔ ان کے مطابق ہندوستان کی ہر زبان ویدک یا پراکرت سے جا ملتی ہے اس لیے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی زبان کس سے نکلی ہے اور کس کا مخرج کیا ہے۔

ڈوگری کے معروف محقق و ادیب دیش بندھو ڈوگرا نُوتن کے مطابق ڈوگری بہ یک وقت جدید بھی ہے اور قدیم بھی۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے نیپالی، میتھلی، بھوجپوری اور مگھئی ہے.... نُوتن کہتے ہیں کہ ڈوگری کا قدیم ذخیرۂ الفاظ کا بیشتر حصہ ایرانی ہے کیونکہ 530-32 ق م میں ڈُگر کا علاقہ ایرانیوں کے زیر اثر تھا اس لیے اس دور کی پرانی فارسی کے ثبوت آج بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ کئی گاؤں کے نام مُنڈا اور دروڑ میں ہیں اور فارسی میں بھی۔ مُنڈا لوگ چونکہ جنگلوں میں آباد تھے اس لیے ان کی بستیاں نہیں ہوتی تھیں مگر جموں خطے میں آج بھی دروڑ ناموں کے گاؤں مل جاتے ہیں جیسے منگلور، میدک، کھیری پلّی۔ نُوتن کا دعویٰ ہے کہ جموں خطے میں تقریباً 65 فیصد گاؤں کے نام فارسی سے ماخوذ ہیں اور 20 فیصد یونانی کے ہیں مگر آریائی زبانوں کے بہت ہی کم ہیں۔ جیسے ایک گاؤں کا نام 'متلوت' ہے جو اصل میں مثلوت ہے کیونکہ ت ٹ اور ث کو ایرانی ت بھی کہتے ہیں اور تھ بھی اور س بھی۔ لیکن یہ ت+تھ+س سے مل کر بنی ہوئی آواز ہے۔ کوئی اسے متلوت کہتا ہے کوئی مثلوت۔ کئی گاؤں ہیں جیسے مجالتہ، بلالتہ، ستیالتہ، سلالتہ، دلالتہ، بندرالتہ، بجالتہ، ماڑھتا، گوالتہ وغیرہ۔ اسی طرح کئی گاؤں کے نام ہیں: دریوت، دیوت، دمنوت، بریوت، بٹوت، بسوت، چڑت، کٹوالت، دھنوالت۔ نُوتن کے مطابق عربی سے مستعار پرانی فارسی کے قاعدے کے مطابق 'تا' مذکر ہے اور 'ت' مونث اور آج بھی ان گاؤں کی تذکیر و تانیث اسی قاعدے کے مطابق کی جاتی ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ 2500 یا 2600 سال پہلے یہاں فارسی کا اثر شروع ہو چکا تھا۔ ایران ایک ترقی یافتہ ملک تھا اور ڈُگر کا علاقہ ایران کی ایک satrapy تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی زبان پر پرانی فارسی کا اثر ہے۔

لیکن یہ ایران پر مسلمانوں کے حملے سے پہلے کی بات ہے۔ ۶۵۱ء میں مسلمانوں نے جب ایران پر حملہ کیا تو عیش و عشرت میں ڈوبا ایران دو تین سو برسوں میں مسلمان ہو گیا۔ ۹۳۶ء میں کچھ بچے کھچے لوگ ایران سے ہندوستان میں آ گئے اور بمبئی کے شمال میں اُدوڈا ½mnokM½ جگہ پر اپنا مندر بنایا۔ گجرات کے راجہ یادو رانا نے انہیں گجرات میں بسنے کی دعوت دی۔ شیریں اور فرہاد مسلمان نہیں پارسی تھے۔ شیریں ایرانی بادشاہ خسرو پرویز کی بیوی تھی اور فرہاد ایران کا ایک سنگتراش۔ یہ برسبیل تذکرہ تھا۔

عربوں کے ساتھ کوئی بلاواسطہ رابطہ نہ ہونے کے باوجود گاؤں کے ناموں میں عربی کا لفظ 'ع' عام ملتا ہے۔ مثلاً بکلوع، سلوع، گندھوع، بتوع، جتوع۔ کیا یہ اتفاق ہے؟

ڈوگری کا لفظ 'نیم' ایک قدیم لفظ ہے، اسے ڈوگری میں اپنا لیا گیا... سنسکرت کا لفظ نیئم (fu;e) تو نیم سے بھی نکل سکتا ہے... بنتیہ (fuR;) بھی بنت (fur) سے نکلا ہے جو پراکرت کا لفظ ہے۔ براہمنوں نے یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ طبقۂ اشرافیہ نے زبان کو پالش کیا، سنوارا، سجایا، وجہ جو بھی رہی ہو۔ جیسے تمل، یونانی یا اسکینڈی نیویائی زبانیں تھیں انہوں نے کئی زبانوں کے الفاظ تصرف کے ساتھ اپنا لیے، یا گھڑے۔ سنسکرت لفظ کیندرا (dsUnz) تمل سے مستعار ہے۔ اسی طرح لفظ انتر (vUrj) ہے جسے ڈوگری میں اینتر (,aUrj) پڑھا جاتا ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اینتر انتر سے نکلا یا انتر اینتر سے، کیونکہ ایک لفظ اندر بھی ہے۔ اور انتر لفظ سنسکرت میں تو ہے لیکن پراکرت میں بھی موجود ہے۔ ویدک کے بہت سارے لفظ اسکینڈی نیویائی بولی یا سلاو زبان میں بھی موجود ہیں۔ دوش (nks"k) کو ہم ڈوگری میں دوس کہتے ہیں... لیکن ہو سکتا ہے کہ ابتدائی لفظ دوس ہو اور انہوں نے اسے دوش بنا دیا ہو.... بنگالی اور بہاری میں بھی س کی جگہ ش بولتے ہیں۔ سنسکرت کے سپتاہ کو فارسی میں ہفتہ کہتے ہیں اور سپتم کو ہفتم۔ سنسکرت میں کہتے ہیں اسُر اور فارسی میں کہتے ہیں اہر... دریائے سندھ کو انہوں نے کہا دریائے ہند.... وہ سندھو کہنا چاہتے تھے لیکن ہندو بن گیا... ویدوں کی زبان اور ایرانیوں کے پرانے مذہبی صحیفوں

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

زیند اویستا (جو ہمارے ویدوں ہی کی طرح چار ہیں) کی زبان میں بہت زیادہ مماثلت ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایران میں 'ہ' اور ہندوستان میں 'س' کی جگہ کوئی دوسری آواز تھی جو ایرانی اور ہندوستانی ہجرت کار دونوں بھول گئے اور اس کی جگہ 'ہ' اور یہاں 'س' نے لے لی۔ زیند اویستا اور ہمارے ویدوں میں منتروں کی مماثلت کے باوجود 'ہ' اور 'س' کا فرق دیکھا جاسکتا ہے۔ کچھ اور مثالیں:

ہندی	اردو	ڈوگری
ماش	ماش	ماہ
راجماش	راجماش	راجماہ
گھاس	گھاس	گہاہ
سانس	سانس	ساہ
پسینا	پسینا	پِ+ہ+نا
پیسہ	پیسہ	پہ+ہا
بس	بس	بَ+ہ
تپس	تپس	ترى+ہ

کہا جاسکتا ہے کہ ڈوگری پر پُرانی فارسی کا اثر ہے کیونکہ فارسی پرانی زبان ہے اور سنسکرت نئی۔ ڈوگری بھی سنسکرت کی طرح پراکرتوں ہی سے نکلی ہے جو پراکرتیں شہروں میں راجاؤں کے پاس پہنچیں وہ ڈویلپ ہوگئیں اور ڈوگری جو شوالک کے پہاڑوں میں بھٹکتی رہی وہ ابھی تک ڈویلپ ہورہی ہے۔ اگر کہیں سے کوئی لفظ ڈوگری میں آیا تو ڈوگری نے اسے بڑی کفائیت کے ساتھ اپنا لیا جیسے گھاس کو گہاہ... سانس کو ساہ... ماش کو ماہ۔ زبان آسانیاں ڈھونڈتی ہے... گھاس، سانس اور ماش میں سے س اور ش ہٹا کر ڈوگری میں آسان بنا دیا گیا۔ س یا ش بولنے میں وقت بھی لگتا ہے اور کوشش بھی، مگر 'ہ' بولنے میں وقت اور کوشش بہت کم۔ ذیل میں دیئے گئے کچھ الفاظ کی فہرست سے وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

انگریزی	سنسکرت	فارسی	ہندی	اردو	ڈوگری
Mother	ماتر	مادر	ماں	ماں	آما
Father	پتر	پدر	پتا	باپ	بب
Brother	بھراتر	برادر	بھائی	بھائی	پہائی
Nose	نس/ نکر	بینی	ناک	ناک	نک
Cow	گئو	گاو	گائے	گائے	گئو
Name	ناما	نام	نام	نام	ناں
Dental	دنتا	دندانی	دانت	دانت	دند
No	نہ	نہ	نہ	نہ	نہ
Five	پانچا	پنج	پانچ	پانچ	پنج
Seven	سپتم	ہفت	سات	سات	ست
Eight	اشٹا	ہشت	آٹھ	آٹھ	اٹھ
New	نَو	نو	نیا	نیا	نماں
Work	کاما	کار	کام	کام	کم
Sun	سُوریہ	خورشید	سُورَج	سُورَج	سُو+ج
Dhoti	دھُنوتی	دوتی	دھوتی	دھوتی	تہوتی
Ghee	گھرِتم	گھی	گھی	گھی	کیہوہ
Shawl	سَتل	شال	شال	شال	شال
Tola	تُلا	تول	تولہ	تولہ	تولہ
Lac	لکھشم	لاک	لاکھ	لاکھ	لکھ

یوروپی ماہرین کے مطابق تقریباً ۳۷۰۰ ق م وید سنسکرت ہی میں لکھے گئے تھے جنہیں دنیا کا قدیم ترین لٹریچر سمجھا جاتا ہے۔ پھر ایک ہزار سال بعد یعنی ۲۶۰۰ ق م کے قریب سمیریائی لٹریچر کا پتہ چلتا ہے۔ اگر کسی زمانے میں ویدک سنسکرت عام طور پر بولی جانے والی زبان نہ ہوتی تو سنسکرت کے ہزاروں الفاظ لاطینی، فارسی، انگریزی یونانی اور دوسری زبانوں میں کس طرح جاسکتے تھے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ دراصل سنسکرت لاطینی، یونانی وغیرہ سے کہیں زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ زبان ہونے کے باوجود ان کے افعال اور صرف ونحو سے قدرے مماثلت اتفاقیہ نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا اشارہ یہ ہے کہ ان زبانوں کا منبع ایک ہی تھا۔ اور اسی لیے ان زبانوں کو پروٹو انڈو یوروپی (Proto-Indo-European) گروپ میں رکھا گیا لیکن کوششوں کے باوجود روئے زمین پر ایسی کوئی زبان نہیں ملی جن میں اس زمرے کی زبانوں کی خصوصیات مل سکتیں۔ کہیں کوئی کنندہ تحریر، یا بولنے والے نہیں ملے اس لیے آخر میں اسی خیال کو تسلیم کرنا پڑا کہ ہندیوروپی زبانوں کا مخرج سنسکرت

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

ہی ہے اور Voltaire کو کہنا پڑا کہ "...گنگا کے کناروں ہی سے یہ تمام چیزیں ہم تک پہنچی ہیں... جہاں براہمنوں نے نسل در نسل دنیا کو پڑھایا..."۔

اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ زبان سہولت ڈھونڈتی ہے۔ اس لیے ابتدا میں آوازیں نسبتاً آسان ہوتیں ہیں۔ ہر بچے کے منہ سے پہلے م، ب، پ، ت، س کی آسان آوازیں پہلے نکلتی ہیں اور بھ، پھ، تھ کی مرکب آوازیں بعد میں اور ٹ، ع، غ، گ، ج، چ، ل وغیرہ کی مشکل آوازیں بہت بعد میں۔

اوپر دیئے گئے الفاظ کی فہرست سے واضح ہے کہ سنسکرت کے الفاظ کا تلفظ ہندی، اردو اور ڈوگری تک جاتے جاتے نسبتاً آسان ہوتا جاتا ہے۔ اسی لحاظ سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ڈوگری سے سنسکرت تک آتے آتے تلفظ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے۔ لہٰذا ٹوتن کا یہ دعویٰ کہ براہمنوں نے ڈوگری یا دوسری زبانوں کے الفاظ کو دانستہ گھڑا ہے اور سنسکرت میں ڈھالا ہے، ان کا ڈوگری موہ قرار دے کر رد نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال زبانیں ایک دوسرے سے الفاظ مستعار لیتی رہتی ہیں۔ بیرونی حملہ آوروں کی وجہ سے صدیوں یہاں الفاظ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ یہ نہیں کہ الفاظ کا یہ لین دین صرف بڑے تاریخی شہروں اور بڑی زبانوں تک ہی محدود رہا بلکہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ شوالک کے پہاڑوں میں محفوظ رہنے والی ڈوگری زبان بھی بیرونی اثرات سے مبرا نہیں رہ سکی۔ چنانچہ آج عربی اور فارسی کے الفاظ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ (لہجے میں کسی قدر تصرف کے ساتھ) ڈوگری زبان میں ضم ہو کر اس طرح زبان زد عام ہو چکا ہے کہ ان کے بن ڈوگری زبان کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اور ان کے متبادلات و مماثلات بھی ڈوگری میں شاذ ہی ملیں گے۔ ملاحظہ کیجئے ڈوگری میں عربی الفاظ:

اجازت (جازت)، احسان (سہان)، ارض، اشتہار، باغ، بحث، بخشنا، بخار، بری، بلاء (چڑیل)، تابعدار، تاثیر (تسیر)، تاج، تاریخ، تاکید، تائید، تبادلہ، تجربہ، تجویز، تحصیل، ترکیب، تشریف، تصویر، تعلق، تعلیم، تعمیر، تعویز، تعینات (تینات)، تقدیر، تقریر، تقسیم، تماشہ، تمہید، تمیز، توفیق (تفیک)، تہلکہ، تہمت، تیار، ثابت، ثبوت، ثعلب مصری، ثواب، جاری، جرح، جاسوس، جائیز، جائیزہ، جابر، جدّی، جراب، جرأت (جُرت)، جُرم، جریب، جسمانی، جعلی، جلّاد، جُلاب، جلسہ، جلوس، جلوہ، جمع، جمہوریت، جنّ، جناب، جنازہ، جنونی، جواب، جہالت، جیب، حادثہ، حاصل، حاضر، حاضری، حاکم، حال، حالت، جبہ، حجامت، حد، حراست، حرام، حرام خور، حرام زادہ، حرج، حرص، حرف، حرکت، حساب، حسرت، حُسن، حشیش، حِصہ، حق، احسان فراموش، حقیقت، حُکم، حُکمران، حکومت، حل، حلال، حُجت، حلوا، حلیم، حُلیہ، حملہ، حوالات، حوالے، حُور، حوصلہ (حونسلہ)، حوض (حود)، حیا، حیثیت، حیران، حیلہ، حیوان، خاتمہ، خارج، خاص، خاص وعام، خاطر، خاطرداری، خال خال، خالی، خبر، خبردار، خبط، ختم، خجل، خدمت، خراب، خرافات، خرقہ (خلکا)، خزانہ، خصم، خصی، خضاب، خط، خطا، خطائی، خطرہ، خطرناک، خُفیہ، خلاص، خلاف، خلقت، خلل، خمار، خمیر، خمیرہ، خمیری، خوف، خیال، خیانت، خیر، خیرخواہ، خیرات، خیریت، داخل، داخلہ، دائیر، دائیرہ، درج، درجہ، درک، دعویٰ، دفع، دفعہ، دِقت، دُکان، دلال، دلالی، دماغ، دنیا، دوا، دوات، دور، دورہ، دولت، دین، ذات، ذرا، ذلیل، ذِمہ، ذِمہ دار، رابطہ، رب، ردّی، رِزق، رِسالہ، رسم، رسوخ، رشوت، رعایا، رعائیت، رعب، رفع دفع، رفو، رکاب، رگ، رمز، رواج، روح، رہن، رہین، رئیس، ریح، ریاست، سالم، سائیل، سبیل، ستر، سخت، سطر، سفید، سلامی، سلسلہ، سلوک، سنائ، سودا، سوداگر، سودائی، سہل، سیر سپاٹا، شارع، شارع عام، شامت، شکر، شکل، شوقیہ، شہد، شہادت، شہر، شہرت، شہید، شیطان، صاحب، صاف، صبر، صحبت، صحت، صحیح، صدقہ، صُراحی، صفا، صفت، صفحہ، صفر، صُلح، صِلہ، صندوق، صورت، ضامن، ضامنی، ضبط، ضرب، ضرور، ضروری، ضلع، ضمیر، طاق، طاقت، طبلہ، طبیعت، طرح، طعنہ، طِلا، طلاق، طمع، طوفان، طُول، طیش، ظالم، ظاہر، ظلم، عادت، عادی، عار، عارضی، عاشق، عام، عبارت، عبرت، عجیب، عدالت، عرصہ، عرض، عرق، عزت، عشق، علاج، علاقہ، علم، عمارت، عُمر، عمل، عوام، عورت، عِوض، عیب، عین، عینک، غائب، غدار، غدر، غرارہ، غرض، غرور، غریب، غریب خانہ، غریب نواز، غصہ، غضب، غلاف، غلام، غلط، غم، غنیمت

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

غور، غیر، فاقہ، فاقہ کش، فائدہ، فتح، فتنہ، فتور، فتویٰ، فخر، فرار، فرش، فرصت، فرض، فرق، فرقہ، فساد، فصل، فضول، فطرتی، فق، فقیر، فکر، فلاں، فنا، فوج، فوجداری، فہرست، فی الحال، فیصد، فیصلہ، قابل، قابلیت، قاعدہ، قافلہ، قالب، قانون، قائل، قبر، قبض، قبضہ، قبول، قتل، قتل عام، قحط، قد، قد کاٹھی، قدر، قدردان، قدرت، قدرتی، قدم، قربان، قرض، قسم، قِسم، قسمت، قصور، قصہ، قلعہ، قلعی، قلم، قول، قوم، قہر، قہوہ، قیامت، قید، قیدی، قیمت، قیمہ، کافر، کافور (کپور)، کتاب، کرامات، کسر، کرسی، کفن، کلام، کمال، لائق، لحاظ، لطف، لفافہ، ماتم، مالک، ماہر، مبارک، مثال، مثلاً، مجال، مجبور، مجرا، مجرم، مجمع، مجموعہ، محال، محتاج، محسوس، محصول، محفل، محکمہ، محل، محلّہ، محنت، مخالف، مخالفت، مخبر، مختار، مختصر، مختلف، مخلوق، مداخلت، مددگار، مدعا، مدعی، مراد، مرض، مرضی، مربہ، مزاج (مجاجن بمعنی نخریلی)، مسافر، مسام، مسکین، مشکل، مصیبت، مضبوط، مضمون، مطابق، مطلب، معہ، معافی، معاملہ، معشوق، معصوم، مغالطہ، مغز، مفاد، مقابلہ، مقدر، مقدمہ، مقصد، مکان، مکر، ملازم، ملامتی، ملائم، ملزم، ملک، منت، منزل، منشا، منشی، منظور، منع، موسم، موقع، موکل، مہلت، مہم (مہیم)، میعاد، نبض، نزلہ، نسخہ، نسل، نشر، نصیب، نصیحت، نظام، نظر، نعت، نفرت، نفع، نقاب، نقد، نقشہ، نقص (نقص)، نقصان، نقطہ، نقل، نواب، نوابی، نوبت، نہر، نہری، نیت، واجب، واحِد، وادی، وارث، واسطہ، وثیقہ، وجہ، وداعی، ورق (برکا)، ورم، وزن، وصف، وصول، وطنی، وعدہ، وغیرہ، وفادار، وقار، وقت، وقعت، وکالت، وکیل، ولائت، ہرج مرج، ہوا، یعنی، یقین۔

ڈوگری میں فارسی الفاظ:

اُمید (مید)، میدوار، بُت، بچہ، بچہ دانی، بخت، بد فعلی، بدکار (بکتار)، بدمعاش، بدنام (بندام)، بدنیت، برداشت، برابر، برائے نام، بستر، بستہ، بند (داؤں)، بندہ نواز، بنفشہ (بنقشہ)، بوجو (بندر)، بہادر، بہتری، بیابان، بے آرامی (بے ارامی)، بے احتیاطی (بے تیاتی)، بے بہا، بے بہار، بے تاثیر (بے تسیر)، بے تحاشہ، بے توفیق (بے تفیک)، بے جان، بچارہ، بے حساب (بے سہاب)، بیخبر، بے درد، بے رحم، بے رونق، بیزار، بے شک، بے شمار، بے ضرورت، بے عزت، بے عزتی، بے عقل، بے شرم، بے عیب، بے غرض، بے غیرت، بے فائدہ، بے فکر، بے قدر، بے گانہ (بگانا)، بے گناہ، بے لحاظ، بیلچہ، بیمار، بے لگام، بے مثال، بے موسم، بے موقع، بے نمک، بے وجہ، بے وفا، بے وقت، بے وقوف، بہار، بہشتی، بے ہمتا، بے ہوش، بیان، بے رنگ، پاجامہ، پازیب (پنجیب)، پار، پاسنگ (پاسکو)، پردہ، پرسال، پُرکار، پرند، پری، پشتینی، پشمینہ، پُل، پلک، پودینہ (پودنہ)، پُلاؤ (پلاٗ)، پہلوان، پہلوانی، پیادہ، پیالہ، پیالی، پیچ، پیچش، پیچیدہ (پچیدا)، پیر، پیروی، پیزار (جوتی)، پیشاب (پشاب)، پیوند، پیوندی، تا (تاں)، تار، تازہ، تالاب (تلاٗ)، تاوان، تبدیل، تبدیلی، تباہ، تباہی، تبر (تبر)، تپ، تخت، تختہ، تختی، تخم، تر، ترس، تری، تسمہ، تلاش، تلچھٹ (تلچھ)، تنبورہ، تنگ، تنگی ترسی، تہ، تہ بازاری، تہ بند، تیر، تیز، تیزاب، جادو، جادوگر، جان، جامہ تلاشی، جرمانہ، جشن، جفاکش، جگر، جگرا، جگری، جلدی، جلد، جمعدار، جمعداری، جنگ، جَو، جوان، جوانمرد، جوانی، جوشاندہ، جوہری، جہاز، چابک، چادر، چار، چارہ، چاقو، چالاک، چالاکی، چائے، چربی، چرکنا، چق، چکا چک، چلہ، چمچہ، چمک، چمکدار، چندہ، کیچڑ (چیکڑ)، خارش، خاطر، خاکی، خام، خام خیالی، خاموشی، خاندان، خاندانی، خانساماں، خانہ، خانہ تلاشی، خُدائی، خرمستی، خراد، خربوزہ، خرگوش، خرید، خزاں، خس، خستہ، خشخاش، خشک، خشکی، خلاصی، دم خم، خمیازہ، خُو، خوار، خواب، خوبی، خودسر، خودغرض، خودغرضی، خودکشی، خودمختار، خوراک، خوردبُرد، خوش، خوش باش، خوشبو، خوشحال، خوشخط، خوشامد، خوشی، خول، خون، خونخوار، خون کا دریا، داد، دارومدار، دارچینی، دارو، داروغہ، داغ، داغی، دامن، دانہ، دبدبہ، در در، دربدر، درمیان، دریافت، درباری، دربان، درخواست، درد، دردسر، دردناک، درزی، درک، درزی، درگاہ، دروازہ، دریا، دست راست، دستکاری، دستانہ، دستک، دستور، دستہ، دشمن، دشمنی، دغاباز، دفتر، دِل، دلیر، دلیری، دم، دم پخت، دُم، دنگ، دنگل، دو، دوبارہ، دوجہاں، دورنگا، دوروزہ، دوطرفہ، دُور، دوراندیش، دور دراز، دوست، دوستی، دیر، دیو، دیوار، راز، رستہ، راہ، رسید، رِشتہ،

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

رشوت، رنجش، رندہ، رنگ، رنگین، رنگ ریز، روبرو، روبکار، روپوش، رواں، روانہ، روز، روزی، روشنی، روغن، رویہ، ریزہ، ریشم، ریشہ، زبان، زبانی، زبردستی، زخم، زر، زرخرید، زمانہ، زمین، زن، زنانہ، زنجیر، زنجیری، زندگی، زندہ، زندہ باد، زنگ، زنگار (جنگال)، زور، زورآور، زوربازو، زیادہ، زیربار، زیرحراست، زیرہ، زین، زیور، سادہ، ساز، سازباز، سازش، سال، سامان (سمیان)، سبزہ، سبزی، سیاہی، سپرد، سپردگی، ستار، سر، سربازار، سردست، سرفروشی، سرکردہ، سرگرمی، سروکار، سردی، سرکار، سُرمہ، سزا، سُست، سفارش، سفیدہ، سفیدی، سمندر، سُنبہ، سوہن، سہ سالہ، سہم، سیاہی، سیب (سیؤ)، سیلاب، سینہ، سینہ زوری، شاگرد، شال، شام، شہتوت، شہزادہ، شہزادی، شاہ، شرم، شروع، شکاری، شکر، شکر پارے، شکن، شکنجہ، شگوفہ، شلوار، شمار، شناخت، سوراخ، شہری، شہتیر، شیر، شیرہ، شیرینی، شیشہ، غش، غشی، غلامی، غوطہ، غیرت، فرشتہ، فرمان، فرمائش، فریاد، فریب، فولاد، قابو، قربانی، کارخانہ، کاروائی، کاریگر، کاشت، کاغذ، کاغذی، کارگر، کج، کدوٗ، کُرتا، کرشمہ، کف، کم از کم، کمبخت، کمان، کوزہ مصری، کوشش، کوفت، کوفتہ، کوک، گردش، گز، گشت، گشتی، گل مالہ (گرمالہ)، گنجائش، گواہ، گُدیا، لاغر، لنگر، مالش، مالیہ، مرد، مُردار، مردانہ، مردم، مُردہ، مُرغا، مُرغی، مرغن، مست، مستانہ، مستی، مُشک، میرا، مزدور، مزدوری، مزہ، مُوشک، موم بتی، مہمان، میاں، میدان، میدہ، میز، میوہ، نابر، ناجائزہ، ناچار، ناحق، نادان، ناراض، ناسمجھ، ناقابل، ناقدری، ناکام، ناکارہ، نالائق، نامرد، نامراد، ناواجب، ناواقف، نازک، ناک، نام، نان، نان بائی، ندارد، نرخ، نزاکت، نشاستہ، نشان، نشانہ، نشانی، نشہ، نفر، نقل، نگوں سار (نگو سار)، نگینہ، نمائش، نمک، نمکین، نمونہ، ننگ دھڑنگ، نوار، نوک، نوکر، نوکری، نیک، نیکی، نیک نام، نیل، نیم حکیم، نیم گرم، واپس، واپسی، واہ، وصولی، ہوش، یخنی۔

ڈوگری میں ترکی الفاظ: بندہ (انسان)، قالین، قُرق، قنات، لاش، ناغہ، ڈوگری میں اُردو الفاظ: باری (موقع، کھڑکی)، بمبا (نہر چشمہ)، بناوٹ (بناوٹ)، بے تال (بے تالا)، بیتانا، بخت، پچنا (پچنا)، تارا، تاناشاہ، تُرپ، ترپال، ٹُرپائی، تڑاکا، تڑتڑ، تِکا (ٹکا)، تندور، توپ، توتا، تہمد، ٹرخانا، جغرافیہ، چانپ، حاطہ، حِسابی، حوالاتی، حویلی، خرچ، خسرہ، خماری، خونی، داغنا، درجن، ذری، دوشالہ، دیمک، ڈنکا، رضائی، رہ جانا، رہائش، رہ رہ کر، زمینداری، زنانی، سڑک، سُلفا، سیلانی، شاملات، شربتی، شرمیلا، شملہ، شوقین، شُہدا، صابن، صافہ، صدقے، صفائی، صفایا، ضبطی، طلبی، طمانچہ، طوطا، غپ، غٹاغٹ، غدود، غلطی، فالتو، فلانا، سیلانی، قصائی، قلابازی، قینچی، کاہلا، کد (کدوں)، کُرتی، کلیجہ، کمانی، کمبل، کنال، کوتوالی، گروی، گزرنا (مرجانا)، گف، گُمانا، مجبوری، محنتی، مخول، مرتبان، مُرکنا (مُڑ کنا۔ موچ آنا) مسالا، مسخری، مورچہ، مہین، مہینہ، نخرہ، نشیلا، نفسانفسی، نقدی، ہالی موالی۔ ڈوگری میں قدیم الفاظ: کنے (ساتھ)، بسارنا (بھلانا)، کولڈا (کوڑا)، نکارا (ناکارہ)، ڈوگری میں پُرتگالی الفاظ: نیلام، نیلامی، کچہری اور یہ زیادہ تر تت سم الفاظ ہیں، یعنی عربی فارسی میں جس طرح سے ہیں اسی معانی میں اور اسی تلفظ کے ساتھ ڈوگری میں رائج ہیں۔ اگر تلفظ میں کہیں کوئی سرمُوفرق ہے بھی تو وہ سہوِ زبانی ہے۔ اسی طرح الفاظ کی ایک کثیر تعداد تت بھوَ الفاظ کی ہے۔ اور پھر ان سے مشتق الفاظ الگ۔ ڈوگری جموں کی نارسا بنجر پہاڑیوں میں بیرونی اثرات سے محفوظ ہی رہی مگر پھر بھی آج بولی جانے والی ڈوگری پر کھس، یوَن (یونانیوں)، تک، گُرجر، ایرانیوں، تُرکوں اور مُغلوں کے اثرات واضح ہیں لیکن ترکوں کی زبان کا کوئی خاص اثر ڈوگری پر نہیں ہوا کیونکہ ترکوں نے خود اپنی زبان ترک کر کے فارسی کو اپنا لیا۔ بہر حال اس موضوع پر یہ ایک اجمالی جائزہ تھا۔ بہت سا تحقیق طلب کام ابھی باقی ہے۔

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

انجمن ستائشِ باہم

■ بلراج بخشی

اردو کے قلم کار (اور ہمارے خیال سے ہندی کے بھی) گزشتہ کئی برسوں سے سرکاری طور پر ایک مشترکہ ادبی کساد بازاری کے دور سے گزر رہے ہیں کہ سرکار اردو (اور ہندی) قلم کاروں کو مناسب احترام اور منصب نہیں دے رہی ہے۔ حالآنکہ اردو اور ہندی کے صرفی ونحوی نظام کے علاوہ بھی دونوں میں بہت کچھ مشترک ہے لیکن آج اس کا کریڈٹ ہم کو دیا جانا چاہیے کہ ہم نے حال ہی میں اردو اور ہندی قلم کاروں کے مشترکہ درد بلکہ سر درد کو دریافت کیا جس کی طرف کسی کی نظر آج تک نہیں گئی۔ دراصل ملکی قوانین میں بہت خامیاں رہ گئی ہیں، اتنا بڑا ملک ہو تو رہ ہی جاتی ہیں۔ یہی دیکھیے نا کہ کوئی بھی شخص، سمجھی بھی، بنا کسی کو اطلاع دیے صبح بستر سے اٹھتے ہی اپنے بارے میں اردو کا ادیب، شاعر یا افسانہ نگار ہونے کا صدماتی اعلان کر دیتا ہے۔ جس سے اس کے رشتے دار اور دوست سن کر سکتے میں آجاتے ہیں۔ حالآنکہ یہ صورت حال امن عامہ کے خلاف ہے لیکن پھر بھی قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن ہماری دانست میں بین الاقوامی حالات کے پیش نظر اسے بھی اب دہشت گردانہ فعل قرار دے دیا جانا چاہیے۔ بہر حال یہ بھی ایک وجہ ہے جس سے شاعروں کی تعداد تشویشناک حد تک بڑھ رہی ہے اور اس سے بہت سے شعری مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں۔ باخبر ذرائع کے مطابق اس وجہ سے بھی ادبی خشک سالی میں افزونی ہو رہی ہے۔

یونیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں 200 سے زیادہ زبانیں ختم ہو چکی ہیں اور تقریباً 6000 میں سے آدھی زبانیں ختم ہونے کے کگار پر آ رہی ہیں بلکہ امکان اغلب ہے کہ سال 2100 تک ختم ہو جائیں گی۔ آسٹریلیا کے شمالی حصے میں 700 لوگوں کا ایک گاؤں ہے جہاں 35 سال سے کم عمر کے محض 350 لوگ native زبان Warlpiri زبان بولتے ہیں۔ تقریباً 200 زبانیں ایسی ہیں جن کے بولنے والے اب محض 10 سے 50 تک رہ گئے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری ثقافتی اور لسانی اکادمیاں مزید زبانیں مینوفیکچر کر رہی ہیں تا کہ زبانوں کی تعداد بڑھتی رہے چاہے ہم کچھ کہیں یا نہ کہیں یا ہمارے پاس کہنے کے لئے کچھ ہو یا نہ ہو۔

ہندوستان ایک بڑا ملک ہے اور اسی لئے بہت ساری تہذیبوں کا گہوارہ بھی۔ یہاں معاشراتی، ثقافتی اور لسانی تنوع اتنا ہے کہ ملکی آئین کے آٹھویں شیڈیول میں 24 زبانیں درج ہو چکی ہیں جن میں انگریزی، ہندی اور اردو کے علاوہ کئی علاقائی زبانیں بھی شامل ہیں جیسے پنجابی، کشمیری، ہریانوی، ڈوگری، مراٹھی، تیلگو، تمل وغیرہ۔ جبکہ ان زبانوں میں بہت کچھ تخلیق کیا جا رہا ہے اور صحتمند اور مستحکم روایات کی حامل ان علاقائی زبانوں میں عالمی سطح کے فن پارے ڈھونڈنے پر کسی بھی ریاست میں سرکاری طور سے ابھی تک کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی ہے کیوں کہ پڑھنے کا چلن ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ ملک کے کسی نہ کسی مخصوص خطے میں بولی اور سمجھی جانے والی ان علاقائی زبانوں کو محض کچھ لاکھ لوگ بولتے، سمجھتے ہیں اور ہر سال ان زبانوں کی ایک ایک کتاب کو حکومت کی طرف سے ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اردو اور ہندی جیسی ملک گیر زبانیں، جنہیں ملک کے کروڑوں لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں ان کی بھی ایک ایک کتاب ہی کو انعام دیا جاتا ہے۔

اب اس صورت حال کو یوں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ علاقائی زبانوں کی کتاب کو ایک ایک ایوارڈ، اور قومی زبانوں کو بھی ایک ایک ایوارڈ۔

یہ ایک جگر سوز امتیازی صورت حال ہے جس سے اردو (اور ہندی کے بھی) کئی دل برداشتہ قلمکار bronchitis کا شکار ہونے لگے ہیں۔ اب اس مرحلے پر ہم ہندی والوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اگر صرف اردو کی بات کریں تو یہ سوال منہ چڑاتا ہے کہ اب اردو قلمکار کیا کرے؟ زمینی صداقت یہ ہے کہ جب اس کی پزیرائی نہیں ہوتی تو اردو قلمکار اپنے خطے کی مقامی زبان میں چلا جاتا ہے اور دو سال بعد یقیناً ایوارڈ یافتہ ہو جاتا ہے۔ تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ علاقائی زبانوں کے سارے لکھنے والے ایوارڈ یافتہ ہوتے جا رہے ہیں اور آئندہ برسوں میں لوگوں کو شاعری کی طرف راغب کرنے کے لئے کئی مراعاتی منصوبے بھی حکومت کے زیر غور ہیں۔

لیکن کئی ضدی قسم کے لوگ بھی ہیں جو اردو سے کوئی ذاتی یا قبیلیائی یا ثقافتی نوعیت کی رنجش رکھتے ہیں اور انتقام لینے کی غرض سے اردو ہی میں ٹکے رہنے کی ٹھان لیتے ہیں اور ایوارڈ کے لئے ان کی مسلسل حوصلہ شکنی کے باعث ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ نہ صرف خود اپنے لئے ایوارڈ قائم کریں بلکہ جب چاہیں لے بھی لیں۔ اور یہی ہو بھی رہا ہے۔ چنانچہ آج یہ حالت ہے کہ حکومت کی امتیازی ایوارڈ پالیسی کے پیش نظر اردو کے قلم کار خود ہی

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

بازار سے کوئی خوشنما سا دکھائی دینے والا ایوارڈ خرید لاتے ہیں، کیمرے کے سامنے کسی سے بھی ایوارڈ لیتے ہوئے فوٹو سیشن کرتے ہیں اور سنڈے ایڈیشن میں چھپوا کر فارغ البال ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی ہمارے ایک آئی اے ایس 'اردو شاعر' جس کی شاعری سے ریاستی اور مرکزی حکومت متاثر نہیں ہو سکی، نے بڑے دھڑلے اور کمال دلیری کے ساتھ سرِ عام قانون کے سامنے خود ہی 'محسنِ اردو ایوارڈ' لے لیا اور پولیس خاموش تماشائی کی طرح دیکھتی رہی۔ ہم نے کہا کہ بھائی یہ تو زیادتی ہے کیوں کہ اردو کے سلسلے میں تو صرف جان گلکرسٹ کو 'محسنِ اردو' کہا جاتا ہے۔ ہمارے دوست نے کہا 'اچھا جی.... میری مادری زبان کمیری ہے..... تو کیا میں اردو میں لکھ کر اردو زبان پر احسان نہیں کر رہا ہوں؟' ایک اور افسانہ نگار دوست نے بازار سے ایوارڈ خرید کر اس پر 'کوہِ افسانہ ایوارڈ' کندہ کروا کر صدر دروازے پر ایک بڑے سے شوکیس میں بڑے اہتمام کے ساتھ رکھ دیا ہے۔

اس قسم کے اردو ایوارڈ دینے والا کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ محلے کا کوئی ابتدائی تعلیمی ادارہ جیسے 'ناگ میموریل اکیڈمی'، بازار میں ہارمونیئم طبلے بیچنے والی دکان جیسے 'سُر تال کیندر' یا کوئی غیر رجسٹرڈ non governmental organization، جیسے 'چیمبر آف چیریٹی' یا 'انڈیا فار کورپشن' وغیرہ بھی ایوارڈ دے سکتے ہیں۔ لیکن اردو کے ساتھ اس قسم کی تنظیموں کی کوئی سوتیلی رشتے داری نہ ہونے کے باوجود بھی ان کی اردو دشمنی کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ ان ایوارڈ دینے والوں کی ایک قسم اور بھی ہے۔ جس میں دو تین لوگ ہوتے ہیں۔ وہ آپ کے گھر میں آ کر آپ کو اپنے اہل خانہ کے ساتھ آپ کے گھر ہی میں کسی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے ایوارڈ دیتے ہوئے اپنے موبائل کے ساتھ آپ کا فوٹو کھنچوا کر اخبار میں چھپوا دیتے ہیں۔ قیام وطعام اور مناسب معاوضے پر وہ کسی دوسرے شہر میں جا کر بھی کسی کو ایوارڈ سے سرفراز کر سکتے ہیں۔ اس غلط فہمی میں نہ رہیے گا کہ اس قسم کے ایوارڈوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یقین کیجیے کم سے کم ہفتے عشرے تک آپ کو نزدیک و دور کے دوستوں، رشتے داروں، دفتر والوں، محلے داروں سے فون پر مبارکبادیں ملتی رہیں گی اور وہ آپ سے پوچھتے رہیں گے کہ یہ تقریب کہاں اور کب ہوئی تھی؟ اور اگر 'ایوارڈ' لیتے ہوئے فوٹو کو آپ فیس بک پر ڈال دیں تو لوگوں کے Likes کی تعداد دیکھ کر آپ خود حیران رہ جائیں گے۔ سال میں دو تین بار ایسا کرنے سے آپ کی عزت میں اتنا اضافہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن اچانک یوم جمہوریہ یا یوم آزادی کی تقریبات میں شمولیت کے لئے آپ کو ضلع کے ڈپٹی کمشنر کا دعوت نامہ بھی آجائے اور آپ بیٹھے بٹھائے شہر کے معززین میں شامل ہو جائیں۔ یہ دعوت نامہ آپ فریم میں جڑا کر ریفریجریٹر کے اوپر بھی رکھ سکتے ہیں تاکہ سند رہے۔

اس سلسلے میں ہمارے مشاہدے میں یہ بھی آیا کہ چونکہ تعزیرات ہند میں ایسی کوئی شق نہیں جس کی رو سے اپنے آپ کو اردو شاعر، افسانہ نگار یا ادیب کہنے کے لئے کسی کے خلاف قانونی کاروائی کی جا سکے اس لئے ہمارے ہاں ان تینوں زمروں میں قلم کاروں کی تعداد تشویشناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ تشویشناک اس لئے کہ ہر کوئی اپنے آپ کو سرکاری ایوارڈ یعنی کچھ نقد رقم، ایک توصیفی سند اور خلعت فاخرہ کا مستحق تسلیم کرنے لگا ہے۔ جس سے آئندہ دنوں میں لاء اینڈ آرڈر کی پرابلم ہونے کا شدید خدشہ ہے اور جس کے بارے میں خفیہ ایجنسیوں نے ابھی بلیو الرٹ بھی جاری کر دیا ہے۔ بہت افراتفری والی سچوئشن بن گئی تھی۔ لہٰذا حکومت کے ساتھ کئی مذاکرات میں جب ہم نے اپنا نکتہ نظر بیان کیا تو ہمیں سنجیدگی سے سننے کے بعد تسلیم کیا گیا کہ چونکہ حکومت کے پاس غریبی ہٹانے، دہشت گردی سے نپٹنے، پانی، تعلیم، بجلی، پانی اور ملزموں کی شناخت صیغۂ راز میں رکھنے کے لئے انہیں سیاہ نقاب بانٹنے اور دوسرے بے شمار مسائل سے نمٹنے کے لئے بھی وقت نہیں ہے اس لئے پرائیویٹ پبلک پارٹنرشپ کے اس دور میں حکومت نے ایوارڈوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر ادیبوں کو رضاکارانہ طور پر آگے آ کر اپنے آپ کو خود انعامات سے سرفراز کرنے کا تعاون مانگ لیا۔ چنانچہ خود انعامی کے اس منصوبے سے نہ صرف ادیبوں کی طرف سے ایوارڈوں کی بڑھتی ہوئی مانگ پوری کی جا سکے گی بلکہ اس سے ملک کی معاشی ترقی کے امکانات بھی بڑھ جائیں گے۔ اس سے شیلڈیں، ٹرافیاں اور میمینٹو (memento) جنہیں اردو کی انعامی تقریبات میں ہم مومینٹو (momento) کہہ کر خوش ہوتے ہیں، کی انڈسٹری بڑھے گی اور روزگار کے امکانات بھی بڑھیں گے۔

یہ سیلف ایوارڈنگ سسٹم بہت جلد لانچ ہونے والا ہے اور ہم نے اس کے لئے تیاری شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ہم نے ایوارڈ لینے اور دینے کے لئے ایک تنظیم کی تشکیل کی ہے۔ جس کا نام ہے: انجمنِ ستائشِ باہم۔ اس تنظیم کے اغراض و مقاصد اس طرح ہیں:

1) مذہب، ذات، برادری، رنگت، جنسی، قبیلیائی اور علاقائی بنیادوں پر حکومت سے اردو ایوارڈوں میں ریزرویشن کا مطالبہ اور اس کے لئے دھرنے، ایجی ٹیشن اور جدوجہد۔

2) نغمگی، غنائیت اور شعریت جیسے عناصر کو اردو شاعری سے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

purge کرنا اور افسانے سے پلاٹ، واقعات، زبان جیسی آلائشوں کو خارج کرنا۔ نثری نظمیں لکھنے والوں کے لئے سبسڈی کے لئے جدوجہد۔

3) ادبی ایوارڈوں کو حکومت کی طرف سے رعائتی قیمتوں پر فراہمی کے انتظامات کروانا اور سرکاری طور پر 'ادبی ایوارڈ میلوں' کا ہفتہ وار انعقاد۔

4) ناشاعروں، متشاعروں، کچہری کے عرائض نویسوں کی زبان والے، amnesia کے شکار 'افسانہ نگاروں' کی پرزور حمایت کر کے اردو مخالف سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔ اخباروں کی سرخیوں سے مستعار پلاٹ پر 'طرحی افسانوں'، اور اقوال زریں اور سبق آموز نصیحتوں پر 'افسانچوں' کے مقابلوں کا انعقاد کروانا۔

5) آزاد غزل، غزل کشت نما، نثری غزل جیسی چیزوں کو فروغ دے کر غزل جیسی 'نیم وحشی صنف' کو ختم کرنے کی کوشش کرنا۔

چنانچہ ہم نے یکطرفہ طور پر انجمنِ ستائش باہم کا عبوری آئین یوں ترتیب دیا ہے:

1) اس تنظیم کا ممبر بننے کے لئے کوئی بھی شخص، بیس روپے کے غیر تصدیق شدہ بیان حلفی میں اپنے آپ کو اردو کا شاعر، افسانہ نگار یا ناقد ہونے کا اقرار کر کے باقاعدہ اعلان کر سکتا ہے لیکن اسے یہ بیان حلفی اپنے گھر کے قریبی تھانے میں جمع کروانا ہوگا۔ اس اعلان کے لئے اردو جاننا قطعی ضروری نہیں ہے۔

2) انجمن کا کوئی بھی رکن جب بھی چاہے، ایک بیان حلفی میں انجمن کا خود ساختہ صدر ہونے کا اعلان کر سکتا ہے۔ صدارت کا دورانیہ طے کرنے کا اسے مکمل اختیار ہوگا۔ اور یہ بیان حلفی اسے ہر وقت اپنی جیب میں رکھنا ہوگا تا کہ مطالبے پر بطور ثبوت پیش کیا جاسکے۔

3) اردو اتنی سخت جان زبان ہے کہ کوئی اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ لہٰذا اردو کی موافقت میں بیان دینے کی کوئی ضرورت نہیں، ہاں اس قسم کا کوئی صدر اردو کی مخالفت میں ایسا کوئی بھی بیان دے سکتا ہے جس سے اردو کی تکا فضیحت ہوتی ہو اور جس کے لئے اس سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔

4) اس قسم کا کوئی صدر جب چاہے کسی بھی مسئلے پر، یا محض تفنن طبع کے لئے انجمن کی ہنگامی میٹنگ طلب کر سکتا ہے، لیکن اس صورت میں حاضرین کی پر تکلف خاطر و مدارات کی ذمے داری بلا شرکت غیرے اسی کی ہوگی۔

5) انجمن کا کوئی بھی ممبر کسی سے مشورہ کئے بغیر ہی اپنے سمیت کسی کو بھی ایوارڈ دے سکتا ہے اور اس کے لئے وہ یقیناً باقی ممبروں کی مبارکباد کا مستحق ہوگا۔

6) متفقہ رائے سے ایوارڈوں کے لئے ذیل کے عنوانات پر مفاہمت بن گئی ہے: تہمتِ اردو ایوارڈ، ذلتِ شاعری ایوارڈ، دشمنِ اردو ایوارڈ، تذلیلِ ادب ایوارڈ، خاتمِ اردو ایوارڈ۔ ویسے ایوارڈ لینے والا ایوارڈ کا عنوان اپنی طرف سے بھی تجویز کر سکتا ہے، مگر اس کے لئے اسے تین سابقہ سیلف ایوارڈیوں سے ایوارڈ کے عنوان کے حق میں حمایت کی ضرورت ہوگی۔

7) ایوارڈ کے ساتھ سنہ لکھنا ضروری ہے۔ جیسے: تہمتِ اردو ایوارڈ 2008

8) انجمن کا ہر سیلف ایوارڈی، میونسپل حکام کی اجازت کے بغیر، اپنے گھر کی گلی میں یا سڑک پر اپنے نام کی تختی لگانے کا مجاز ہوگا، جیسے: فریادی اسٹریٹ، زخمی روڈ یا چراغ ظلماتی چوک۔ اور اگر ایک گلی میں دو ایوارڈی رہتے ہوں تو گلی کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ پوسٹ آفس والے انہی چھٹیوں کو تقسیم کریں گے جن پر بدنام زخمی اسٹریٹ یا فریادی روڈ، یا چراغ ظلماتی چوک لکھا ہوگا۔

9) اس قسم کے ہر سیلف ایوارڈی پر اپنی تعریف میں کم سے کم ایک مضمون کسی ریسرچ اسکالر سے اور کچہری کے عرائض نویس سے دو مضامین لکھوا کر کسی روزنامے یا ہفت روزہ اخبار میں شائع کروانا لازمی ہوگا تا کہ دوسروں کو عبرت ملے۔

10) ان مضامین میں بیان کی گئی آرا کو حتمی اور حرف آخری سمجھا جائے گا جن کی تحقیر و تضحیک پر ازالہ حیثیت عرفی قانون کے تحت فاسٹ ٹریک کورٹ میں کاروائی کی جاسکتی ہے اور اس قسم کی کسی حرکت کو پڑوسی ملک کی سازش تسلیم کر کے مذکور سیلف ایوارڈی کو حکومت سرکاری سیکورٹی مہیا کرے گی۔

انجمنِ ستائش باہم کے قیام کے سلسلے میں ہمارے جوش وخروش اور عملی کوششوں سے متاثر ہو کر گزشتہ دنوں ایسی ہی ایک این جی او نے ہمیں بھی ایوارڈ دینے کی پیشکش کی ہے جس کے لئے ہمیں صرف چائے اور بسکٹوں کی زحمت اٹھانے کو کہا گیا ہے۔

انہوں نے ہم سے ایوارڈ کا عنوان تجویز کرنے کے لئے کہا۔ اپنی کم مائیگی کو پیشِ نظر رکھ کر بہت سوچنے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ ہم چونکہ ضلع یا تحصیل سطح کے قلمکار بھی نہیں ہیں اور ہمارا گھر عیدگاہ روڈ پر واقع ہے اس لئے ہم نے انہیں بڑے انکسار سے، ایوارڈ پر 'فخرِ عیدگاہ روڈ' لکھوانے کے لیے حامی بھری ہے۔ گزارش ہے کہ 'فخرِ عیدگاہ روڈ ایوارڈ' ملنے پر ہمیں آپ کی جانب سے مبارکبادوں، اور فیس بک پر Likes کا انتظار رہے گا۔

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

زبان وبیان

■ بلراج بخشی

ملک بھر میں ریاست جموں کشمیر اکلوتی ریاست ہے جہاں گزشتہ سوا سو برس سے اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے مگر میں نے، کم سے کم اپنی زندگی میں، ایسا کچھ نہیں دیکھا یا محسوس کیا جس سے پتہ چلے کہ جموں کشمیر میں اُردو کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ کم نہیں کہ کسی کی مادری زبان نہ ہوتے ہوئے بھی اُردو کو یہاں سوا سو سال سے زیادہ عرصہ تک سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ مقامی زبانوں کو حاصل مراعات اور شووِنزم کے تناظر میں اُردو کو اب دو ایک مشاعروں ہی تک محدود کر کے گلوخلاصی حاصل کر لی گئی ہے۔

لیکن ریاست جموں کشمیر میں اس اردو کش ماحول کے باوجود 'زبان و بیان' کی اشاعت کوئی حیران کن نہیں ہے۔ اِس سے پہلے بھی اِس نوعیت کی کئی کاوشیں ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ سرکاری سطح پر جموں کشمیر کلچرل اکادمی 'شیرازہ، اردو' شائع کر رہی ہے۔ ریاستی محکمہ اطلاعات کسی زمانے میں 'تعمیر' نکالتا تھا۔ سری نگر سے 'ترسیل' نکلتا تھا۔ جموں یونیورسٹی سے 'تسلسل' اور کشمیر یونیورسٹی سے 'بازیافت' شائع ہوتا تھا۔ حکیم منظور مرحوم 'خبر ونظر' کے نام سے رسالہ نکالتے تھے جس میں کشمیری کے دو صفحات کے علاوہ باقی صفحات اردو کے لئے معنون تھے۔ سری نگر سے حامدی کشمیری کا 'جہات'، وحشی سعید کا 'نگینہ'، نور شاہ کا 'اردو اکادمی' اور انت ناگ سے زاہد مختار کا 'لفظ لفظ' شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان باقاعدہ اردو ادبی رسائل کے علاوہ سری نگر سے روزنامہ 'آفتاب'، 'کشمیر عظمیٰ' اور جموں سے 'اُڑان' ہفتہ میں ایک صفحہ اُردو کے نام مختص کر دیتے ہیں۔

اکیسویں صدی کے پہلے دوسرے عشرے میں چھانکن برج سری نگر کشمیر سے ابن اسماعیل نے 'بزم ادب' کے نام سے ایک معیاری کتابی سلسلہ شروع کیا تھا جس کے کم سے کم گیارہ شمارے شائع ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ سے راجوری سے عمر فرحت کتابی سلسلہ 'تفہیم' شائع کر رہے ہیں۔ لیکن جموں میں ادبی سلسلوں کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

1936 میں چراغ حسن حسرت کے عزیز سراج الحسن سراج میر پور سے صادق نکالتے تھے۔ اس دور میں دیانند پور پر بات کے نام سے رسالہ شائع کرتے تھے جس کی اشاعت ان کی وفات کے بعد بھی ان کے فرزند موتی لال کپور نے کچھ عرصہ تک جاری رکھی۔ جگن ناتھ آزاد نے بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے لئے سرکاری رقوم سے ایک ادبی رسالے کے کم سے کم دو شمارے شائع کیے تھے۔

جموں ریاست کی سرمائی راجدھانی ہے۔ اور جموں میں اردو شعراء کی خاصی روایت رہی ہے۔ منوہر لعل دل، عابد مناوری، مہیش کشمیری، ہنس راج شاداں، عرش صہبائی، وِدیا رتن عاصی کا شمار جموں کے نامور شعرا میں رہا ہے۔ جموں کے تقریبا تمام ڈوگری شاعروں نے بھی اپنے ادبی سفر کا آغاز اردو ہی سے کیا تھا۔ لیکن کمال ہے کہ جموں سے کبھی کسی اردو ادبی جریدے کی اشاعت نہیں کا ذکر نہیں ملتا۔

راجوری سے نند گوپال باوا کا 'نوری چھم'، اقبال نازش اور فاروق مضطر کا 'دھنک'، ایوب شبنم کا 'ستاروں سے آگے' کے عنوان سے ادبی رسائل شائع ہوئے۔ فاروق مضطر آج بھی دبستان ہمالہ کے عنوان سے ایک سہ ماہی شائع کر رہے ہیں۔ جموں سے صرف ایک ادبی رسالہ شائع ہونے کا پتہ چلا ہے جس کا عنوان تھا 'العطش'۔ مگر کمال ہے کہ اس رسالہ کے پبلشر اور مدیر راج کمار چندن کا تعلق بھی راجوری سے ہے۔

سہ ماہی 'زبان و بیان' بھی اسی سلسلے کی توسیع ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ متذکرہ بالا رسائل کتنا فاصلہ طے کر سکے تھے۔ سوال یہ بھی نہیں۔ تھے۔ سوال یہ بھی نہیں ہے کہ زبان و بیان کتنی دور جا سکے گا۔ سوال یہ ہے کہ کسی قسم کے سرکاری تحفظ کی عدم موجودگی میں بھی اگر اتنے رسائل اردو میں شائع ہوتے رہے ہیں تو کیا اس سے یہ شفی نہیں ہے کہ اردو زبان اپنی بقا کے لئے مراعات کی مرہون نہیں ہے بلکہ یہ زبان اپنی سخت جانی اور اپنے سحر و فسوں کے باعث ذہنوں کو اس حد تک متوجہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے کہ مالی منفعت کی امید کیے بغیر ہی لوگ اردو میں سنجیدہ ادبی جریدے شائع کرنے سے خود کو روک نہیں سکتے۔

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

نثری نظم

■ بلراج بخشی

اظہار و بیان کی دو واضح قسمیں ہیں: نثر اور نظم۔ ظاہر ہے دونوں اصناف کے اپنے اپنے خصائص ہیں جن کے مدنظر انھیں ایک دوسرے سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے اردو کو نثری نظم کی وبا نے آن گھیرا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ کسی دوسری زبان میں بلینک ورس کے محرکات کیا تھے، اردو میں نثری نظم کی وبا کی کاشت کا کوئی جواز نہیں ملتا۔

Content کی شدت اپنے اظہار کے لئے خود ہیئت وضع کر لیتی ہے۔ مگر اب تک اردو میں جو نثری نظمیں دیکھی گئی ہیں ان میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ ان نظموں میں مصرعوں کو گرامر کے قوائد کی نفی کر کے توڑ مروڑ کر لکھنے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا جن میں content ہے ہی نہیں۔ اچھے اچھوں کی طبع آزمائی کے باوجود کسی ایک نثری نظم کو بھی نمونے کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا جو اپنے content کے اعتبار سے لاثانی ہو اور اس content کو پابند نظم کی ہیئت میں پیش نہ کیا جا سکتا ہو۔

الفاظ کی دروبست میں انتشار و انقباض پیدا کر کے جملوں کے ٹکڑوں کو سطروں میں بانٹ دینا اور پھر آخیر میں چونکانے والا ایک آدھا ادھورا جملہ چسپاں کر دینا ہی نثری نظم کی معراج قرار پایا ہے۔ یار لوگ جسے نثری نظم کہہ رہے ہیں وہ سرے سے نظم ہی نہیں ہے کیوں کہ وہ منظوم ہی نہیں ہے۔

نثری نظم میں سر مارنے والے عموماً وہی لوگ دیکھے گئے ہیں جو پابندیوں میں کوئی تیر نہ مار سکے۔ یا پھر ایک اور قسم بھی ہے جو عروض سے واقف نہیں۔ کچھ برس ہوئے افتخار امام صدیقی نے شاعر ممبئی میں سری نگر کشمیر کی ایک محترمہ کا انٹرویو شائع کیا تھا جس میں محترمہ نے دعویٰ کیا تھا۔ میں محترمہ نے دعویٰ کیا تھا کہ نثری نظم میں بھی نہ صرف اچھی شاعری کی جا سکتی ہے بلکہ گیت بھی لکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے فلم 'حقیقت' کے اس گیت کا حوالہ دے کر اسے ایک کامیاب نثری نظم قرار دیا تھا:

'میں یہ سوچ کر اس کے در سے اُٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو۔
ہواؤں میں لہراتا آتا تھا آنچل
کہ دامن پکڑ کر بٹھا لے گی مجھ کو.......

....

مگر اس نے روکا، نہ مجھ کو بلایا، نہ آواز ہی دی
نہ واپس بلایا، میں آہستہ آہستہ چلتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جدا ہو گیا میں.......'

دراصل ان محترمہ کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ یہ ایک کامیاب آزاد نظم ہے اور باقی آزاد سم ہے اور باقاعدہ بحر میں ہے۔ ترقی پسندی، جدیدیت اور اب یہ نثری نظم۔ جب آزاد غزل، غزل نما، ہائیکو، افسانچہ وغیرہ کی صورت میں اُردو ادب نے حملے برداشت کر لیے ہیں تو نثری نظم کا حملہ بھی برداشت کر لیا جائے گا۔

دانش الہ آبادی موقر رسالے 'سبق اردو' الہ آباد کے مدیر ہیں۔ وہ 'ساہتیہ میگھ' کے نام سے ایک ہندی ادبی رسالہ بھی شائع کرتے ہیں۔ اور اب 'ادبی زاویئے' کے عنوان سے ایک نیا اردو رسالہ جاری کر رہے ہیں جو بقول ان کے صرف نثری نظم کے لئے وقف ہوگا۔ انہوں نے 20 دسمبر 2022 تک اس رسالے کے لئے نثری نظمیں بھی طلب کی ہیں۔

☆☆☆

کہاں سے منظر سمیٹ لائے کہاں سے منظر ادھار مانگے
روایتوں کو نہ موت آئے تو زندگی انتشار مانگے

بلراج بخشی

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

اطہر فاروقی ..... نارنگ پر

■ بلراج بخشی

میرا ایک دوست تھا، لیش پال کھجوریہ۔ 1970 کے عشرے میں اسے سیاست کا چسکہ لگ گیا اور یوتھ کانگریس میں شامل ہوگیا۔ یہ سنجے گاندھی کا زمانہ تھا۔ لیش پال زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اور نہ ہی برسرِ روزگار تھا مگر وہ کانگریس کی سیاست میں اتنا الجھ گیا کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ کبھی دہلی، کیا کبھی بنگلور، کبھی گواہاٹی۔ وہ شیو نہیں کرتا تھا، کپڑوں کا کوئی شوق نہیں تھا سگریٹ نہیں، شراب نہیں، چائے ملی تو پی لی، کھانا ملا تو کھالیا، جہاں اور جس حال میں بھی سونے کی جگہ ملی، سو گئے۔ میں اس سے پوچھتا کہ دہلی کب جا رہے ہو تو کہتا کہ جب کوئی مال بردار ٹرک مفت لے جائے گا تو چلا جاؤں گا۔ میں پوچھتا کہ دہلی سے واپس کب آؤ گے تو کہتا جب کوئی مفت کی گاڑی مل جائے۔ کئی سال تک اس کا یہی معمول رہا اور اس کے اس معمول کی خبر صرف مجھے تھی یا کچھ قریبی دوستوں کو۔ اس کے گھر والوں کو بھی پتہ نہیں تھا اور وہ اس سے نالاں ہی رہتے تھے۔ 1975 کی ایمرجینسی کے بعد اندرا گاندھی کو عام انتخابات میں شکست ہوئی، کئی لوگوں نے اندرا گاندھی کا ساتھ چھوڑ دیا مگر لیش پال کھجوریہ وہیں بنا رہا اور یہی وجہ تھی کہ سنجے گاندھی کی حادثاتی وفات کے بعد راجیو گاندھی نے میرے دوست کو کانگریس کی ٹکٹ دے دی۔ جب وہ ایم ایل اے بن گیا تو لوگوں کو حیرت ہوئی لیکن جب وہ منسٹر بھی بن گیا تو اُدھم پور کے لوگ مہینوں ایک دوسرے سے سوال کرتے رہے کہ یہ منسٹر کیسے بن گیا؟ لوگوں کو کیا پتہ کہ اس نے کتنے برسوں تک کتنے مصائب کا سامنا کیا تھا۔

ایک اور دوست تھا۔ وہ ٹین کے بکسے اور الماریاں وغیرہ بناتا تھا جس کے لیے جموں کشمیر کا محکمہ صنعت اسے سستے داموں پر ٹین کا کوٹہ فراہم کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک ٹوٹا پھوٹا سا کھٹارا اسکوٹر تھا جس پر دو تین بار مجھے بھی اس کے ساتھ یہاں سے 65 کلومیٹر دور جموں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہر بار اسکوٹر راستے میں خراب ہو جاتا اور وہ رک کر گھنٹہ گھنٹہ بھر اس سے اُلجھا رہتا۔ جموں میں پہنچ کر وہ وئیر ہاؤس کے کسی کاروباری سے پیسے لے کر محکمہ صنعت کی خام مال فراہم کرنے والی ایجنسی کے دفتر میں ڈیڑھ دو کلومیٹر کا سفر بھری گرمی میں کرتا۔ مجھے اس لئے پتہ ہے کہ ایک دو بار میں بھی اس کے ساتھ گیا تھا۔ وہاں پیسے جمع کروا کر ٹین کا کوٹہ ٹھیلے پر لدوا کر واپس وئیر ہاؤس آکر کاروباری کو بلیک میں دیتا اور اپنا منافع لے لیتا۔ بہت جدوجہد تھی۔ کسی طرح اس کی شادی بھی ہوگئی۔

انھی دنوں سیمنٹ کے پانچ فٹ کے fencing کے کھمبوں کا دور آیا۔ اتفاق سے اس کا خسر پنجاب کے کسی بینک میں تھا۔ اس نے پنجاب سے سیمنٹ اور سریا کا جگاڑ کیا، بینکوں سے کریڈٹ limit بنوائی اور کاروبار چلنے لگا۔ ایک دن جب اس نے نئی کار خریدی تو لوگ سوال کرنے لگے کہ آخر اس نے کار کیسے لی۔

میں نے دیکھا ہے کہ اس قسم کے سوال کرنے والے عموماً وہی لوگ ہوتے ہیں جو خود کچھ نہیں کرتے بلکہ ہر گلی محلے کے چوراہے میں بیٹھے تاش کھیلتے ہیں اور آتی جاتی خواتین کے جسموں کے خطوط دیکھ کر بھونڈے لہجے میں ان کے زیر جامے کے سائز کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں۔

ان دو واقعات کا اردو ادب یا کسی بھی ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دو واقعات تب یاد آئے جب میں نے انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کی سہ ماہی اشاعت 'اردو ادب' کے شمارہ نمبر 63-261 (جنوری تا دسمبر 2022) میں اطہر فاروقی کا پہلا ورق (صفحہ 6) دیکھا جس میں موصوف نے گوپی چند نارنگ پر اظہار خیال کیا ہے۔

اطہر فاروقی کی تحریر سے عیاں ہے کہ یہ گوپی چند نارنگ کے صحیح یا غلط ادبی نظریے پر کوئی اختلافی تبصرہ نہیں ہے بلکہ ایک ذاتی نوعیت کی بھڑاس نکالی گئی ہے جس میں نارنگ کی مادی حصولیابیوں کے متعلق جلی کٹی سنائی گئی ہے اور جس سے قاری کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ نارنگ کے گھر کا نقشہ کیسا تھا، کتابیں کتنے سلیقے سے رکھی گئی تھیں، کپڑے کیسے پہنتے تھے، شراب کون سی پیتے تھے، اپنی رہائش گاہ میں لفٹ لگوائی تھی، اردو کے ایک معمولی لیکچرر ہوتے ہوئے بھی بے پناہ ترقی کی اور پیشہ ورانہ شعبے میں آگے بڑھنے کے لئے انھوں نے کیسے کیسے طریقے استعمال کیسے وغیرہ وغیرہ۔ اطہر فاروقی کا لہجہ واضح طور پر حاسدانہ ہے۔ زندگی میں ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

کامیاب ہوتا ہے کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں حیرت کی بات کیا ہے۔ اگر نارنگ نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے امکانات کو اپنے موافق کیا یا خود امکانات کے موافق ڈھل گئے اور کئیوں کی نسبت زیادہ کامیاب رہے، تو اس میں کسی کو جلن نہ ہونی چاہیے۔

اطہر فاروقی نے کہا ہے کہ نارنگ نے اپنے چہرے پر سیکولرزم اور ترقی پسندی کا مکھوٹا چڑھایا ہوا تھا۔ تو کس نے نہیں چڑھا رکھا ہے بھائی۔ اب تو یہ طشت ازبام ہو چکا ہے کہ کسی غیر تحریری معاہدے کے تحت سبھی صرف ایک دوسرے کے سامنے ہی سیکولرزم کا ڈراما کرتے ہیں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ تمام فرقے اپنی اپنی عصبیتوں اور تحفظات کے ساتھ جیتے ہیں۔

لیکن اس قسم کی باتیں کر کے اطہر فاروقی کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں، سمجھ سے باہر ہے۔ اصل میں کسی بھی شخص کی قدر و قیمت معاشرے میں اس کی contribution سے لگائی جاتی ہے نہ کہ اس سے اس کی ذاتی عادتیں کیسی ہیں۔

کارل مارکس شراب پیتا تھا، عورتوں کا رسیا تھا لیکن اپنے وقت کا عظیم مفکر تھا جس کے نظریات نے آج تک دنیا کے ذہنوں کو جکڑ رکھا ہے۔ اس لیے نارنگ کی قدر و قامت طے کرنے کے لیے ان کی ذاتی عادات کے بجائے ان کے ادبی نظریات کو بنیاد بنانا چاہیے تھا۔

مزہ تو تب تھا جب عمران شاہد بھنڈر نے نارنگ کے خلاف مہم شروع کی تھی اور حوالے دے دے کر کہا تھا کہ نارنگ صاحب کی کتابوں کا متن کہاں کہاں سے اٹھایا گیا ہے، تب تو اطہر فاروقی سامنے نہیں آئے۔ اور اب جب کہ نارنگ اس دنیا میں نہیں ہیں اور اپنا دفاع نہیں کر سکتے تو اس قسم کی نازیبا اور ناخوشگوار باتوں سے کیا فائدہ۔ لیکن نارنگ نے اپنی زندگی میں بہتوں کو مستفیض بھی کیا ہے۔ اب بھی ان کے بہت سے عقیدت مند ہوں گے۔ لوگ چپ چاپ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ مگر محلے کے چوراہے پر تاش کھیلنے اور آتی جاتی خواتین کو ندیدوں کی طرح تاڑنے والے لوگ صرف حیران ہوتے رہتے ہیں کہ کوئی منسٹر کیسے بن گیا یا کسی نے کار کیسے لے لی یا کسی نے کتابیں کیسے لکھ لیں۔

☆☆☆

التماس

اہلِ قلم حضرات سے التماس ہے کہ وہ اپنی قیمتی نگارشات سہ ماہی رسالہ 'زبان وبیان' کے لیے ارسال فرمائیں اور مرسلہ تخلیق کے طبع زاد اور مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ہونے کی تصدیق بھی لازمی طور پر کریں۔

* درج ذیل ای میل پر یا ڈاک سے موصول (ان پیج میں کمپوزڈ اور پروف درست) تخلیق اور مکتوب کو اشاعت میں ترجیح دی جائے گی۔

برائے مہربانی یونی کورڈ فونٹ میں تخلیق نہ بھیجیں۔

واٹس ایپ پر ان پیج میں کمپوزڈ اور پروف ریڈنگ کی ہوئی تخلیق قابلِ قبول ہے۔

Email: zubaanobayaan4@gmail.com

* تخلیق کے ساتھ انگریزی میں اپنا مکمل پتہ مع پن اور موبائل نمبر درج کیجیے۔

* تبصرے کے لئے کتاب یا رسالے کی دو جلدیں ارسال کریں۔

مدیر

☆☆☆

ستم نئے سے نئے ہم پہ ڈھائے جاتے ہیں
کہ رونا چاہتے ہیں جب ہنسائے جاتے ہیں

خطائیں ایسی کہ ہوتی ہیں خود بخود سرزد
فریب ایسے کہ دانستہ کھائے جاتے ہیں

کوئی سراغ نہ چہرہ بیاں کرے بلراج
دلوں کے درد دلوں میں چھپائے جاتے ہیں

بلراج بخشی

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

غزلیں

■بلراج بخشی

۱

تُو گرجتا ہے کہاں اور برستا ہے کہاں
کچھ خبر ہے ترا رستہ کوئی تکتا ہے کہاں

سالہاسال سے میں ڈھونڈ رہا ہوں تجھ کو
موسم گل تُو یہاں آ کے ٹھہرتا ہے کہاں

درس دیتا ہی رہا اچھے برے کا خود کو
مرے کہنے سے مگر کوئی سمجھتا ہے کہاں

زندگی میں ترے آخر پہ چلا آیا ہوں
اب یہاں میرے لیے دوسرا رستا ہے کہاں

دلِ قاتل میں ہے بلراؔج بڑی مدت سے
اس کی جرأت تو ذرا دیکھیے رہتا ہے کہاں

۲

یقیں ہی اب یقینوں میں نہیں ہے
کوئی سجدہ جبینوں میں نہیں ہے

جو لمحہ فیصلے کا ڈھونڈتا ہوں
دنوں ، ہفتوں ، مہینوں میں نہیں ہے

ہوائیں آ رہی ہیں جا رہی ہیں
کہیں سرحد زمینوں میں نہیں ہے

جنوں میں پاؤں ہی آئیں تو آئیں
تحرک کوئی زینوں میں نہیں ہے

نظر ہے، ہوش ہے، دل بھی ہے لیکن
کوئی بھی ربط تینوں میں نہیں ہے

حیا پردہ نشینوں میں ہو شاید
وفا لیکن حسینوں میں نہیں ہے

جسے افسوس بھی ہوتا، خوشی بھی
وہی گھر کے مکینوں میں نہیں ہے

بہت کچھ منحصر ہے لمس پر بھی
نزاکت آبگینوں میں نہیں ہے

مجھے تو فکر ہے بلراؔج ان کی
محبت جن کے سینوں میں نہیں ہے

۳

کبھی اپنے کبھی اغیار نظر آتے ہیں
سائے بھی کتنے پراسرار نظر آتے ہیں

اب نئے شہر کا نقشہ نہ بنایا ہو کہیں
پھر اجڑتے ہوئے گھر بار نظر آتے ہیں

جان لیتے رہے دیتے بھی رہے جن کے لئے
آج وہ مسئلے بے کار نظر آتے ہیں

معجزہ یہ بھی سیاست کا کوئی کم تو نہیں
دو نہیں ہوتے مگر چار نظر آتے ہیں

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

جس نے جو چاہا وہی چھین لے گیا ہم سے
اب تو کوئی لٹا بازار نظر آتے ہیں

وقت نے چہرے پہ وہ نقش گری کی بلراج
اب تو جیسے کوئی شہکار نظر آتے ہیں

۴

آج کل کچھ بھی سلیقے سے نہیں ہوتا ہے
دل کہیں اور دماغ اور کہیں ہوتا ہے

اب قرینے سے رکھا جائے گا ہر رشتے کو
اب کہاں کوئی کسی دل کا مکیں ہوتا ہے

اس لیے دیکھتا ہوں شک کی نظر سے خود کو
وہی دیتا ہے دغا جس پہ یقیں ہوتا ہے

میں بھی شاید نظر آ جاؤں تری محفل میں
جو کہیں بھی نہیں ہوتا وہ یہیں ہوتا ہے

اب وہ پہلے سے مراسم تو نہیں ہیں بلراج
میں جہاں ہوتا ہوں اکثر وہ وہیں ہوتا ہے

۵

مقدر تھا ستاروں کے حوالے
ہوئے ہم بھی سہاروں کے حوالے

ہمارا جو بھی ہو گا دیکھ لیں گے
کیا تم کو بہاروں کے حوالے

بیاں ہوتا نہیں الفاظ میں جو
اشاروں، استعاروں کے حوالے

ہماری آبلہ پائی کا صدقہ
کہ ہم ہیں خارزاروں کے حوالے

ابھی معلوم ہو گا ظرف ان کا
چلو ہو جائیں یاروں کے حوالے

انہیں ہی کاٹتا ہے کیوں سمندر
ہوا ہے جن کناروں کے حوالے

فریبوں میں رہا بلراج لیکن
یقینوں، اعتباروں کے حوالے

۶

کہیں بھی زندگی اپنی گزار سکتا تھا
وہ چاہتا تو میں دانستہ ہار سکتا تھا

زمین پاؤں سے میرے لپٹ گئی ورنہ
میں آسمان سے تارے اتار سکتا تھا

جلا رہی ہیں جسے تیز دھوپ کی نظریں
وہ ابر باغ کی قسمت سنوار سکتا تھا

عجیب معجزہ کاری تھی اس کی باتوں میں
کہ وہ یقیں کے جزیرے ابھار سکتا تھا

مرے مکان میں دیوار ہے نہ دروازہ
مجھے تو کوئی بھی گھر سے پکار سکتا تھا

پر اطمینان تھیں اس کی رفاقتیں بلراج
وہ آئینہ میں مجھے بھی اتار سکتا تھا

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

نظمیں

■ بلراج بخشی

دنیا بھر کے جنگبازوں کے نام

جنگبازو!
اسلحہ خانوں کے دروازے
مقفل کر کے دیکھو تو سہی
یہ آسماں کی نیلگوں وسعت،
شفق کی سرخیاں
نوخیز سورج کی شعائیں،
کی بدلیاں، کالی گھٹائیں،
سبز میدانوں کی ہریالی،
سنہری بالیاں گیہوں کی،
خوشے لہلہاتے دھان کے کھیتوں میں،
بارش میں دھلے پتے،
گھنی چھاؤں درختوں کی،
سحر انگیزیاں صد رنگ پھولوں کی،
فضاؤں میں ہزاروں خوشبوؤں کا رقص لافانی،
خزاں میں جالیاں بے برگ شاخوں کی،
زمستانی ہواؤں میں
لحافوں میں چھپی وہ گرم سانسیں،
قرب کے وہ جاوداں لمحے،
یہ سارے منتظر ہیں
اک نظر تم دیکھ لو ان کو،
اگر پہچان لو ان کو
تو ان کی زیست کی تکمیل ہو جائے،
انہیں عنوان مل جائے،
کہ ابھی کی وہ معراج کو پہنچیں۔
ابھی رک جاؤ،
بارودی سرنہیں مت بچھاؤ۔
تم پر لازم ہے بہاروں کا تحفظ،
پھول کی خوشبو کا متبادل نہیں بارود کی بو۔
سونگھ کر دیکھو۔
فضاؤں میں بسی ہے
خون کی کچی مہک۔
اور گدھ، چیلیں
کس قدر مسرور ہیں، خوش ہیں،
قیامت خیز ان کا شور کیا تم سن نہیں سکتے؟
دھوئیں کے بادلوں نے،
اور بارودی دھماکوں،
زخمیوں کی سسکیوں، چیخوں، کراہوں نے
تمہیں پتھر بنا ڈالا؟
وہ دیکھو!!
دور واپس گھر میں
دوشیزائیں سوئی راہ پر نظریں جمائے
تھک گئی ہوں گی۔
تمہاری مائیں، بہنیں، دوست، بھائی،
گھر، گلی کوچے
تمہاری چاہ میں مرکھپ رہے ہوں گے۔
تمہارا گھر بھی تھا کوئی۔
تمہیں احساس کب ہوگا
کہ تم ہو ایشیائی سورما، یا یوروپی جانباز ہو،
تم سب بہادر ہو، بھی غیور ہو، جرار ہو تم سب،
بھلے ہی ہند و پاکستان کے ہو،
تم کہ امریکی، عراقی ہو یا افغانی،
فلسطینی ہو یا اسرائیلی ہو،
ہو یا سب اسی دھرتی کی مٹی سے بنے ہو،
سب یہیں کی خاک سے اٹھے ہو۔
خون آلودہ سنگینیں گھڑی بھر کے لئے چھوڑو۔
سبز میدانوں کی جانب دیکھ تو لو۔

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

گلستاں ڈھونڈو
کہیں اک فاختہ، کوئل،
کوئی تتلی
تمہیں ہی ڈھونڈتی ہوگی۔
کہ تم ویران آنکھوں میں
سجالو رنگ کوئی، سنگ کوئی۔
تھک گئے ہوگے
ذرا آرام ہی کرلو،
گھڑی بھر کے لیے تم لوگ بھی جی لو۔

مٹی کے موسم

بدلتے ہوئے موسموں سے مجھے ہے شکایت
کہ دہراؤ کا یہ تسلسل بھی
بے رنگ یکسانیت کے سوا اور کیا ہے۔
کہ مٹی کے موسم،
وہی گرمیاں، سردیاں
اور خزائیں بہاریں
جو یکساں تناسب سے
مجھ کو پکاریں۔
بدلتے ہوئے موسموں سے میری التجا ہے
اگر ہو سکے تو مرے گھر کے آنگن میں
ہر روز ایسی شعائیں اتاریں
جو پہلے کی ساری شعاؤں سے ہوں مختلف اور نئی،
میری آنکھوں میں بھر دیں نئے رنگ
جو سات رنگوں کی فہرست میں بھی نہ ہوں۔
رات دن کا یہ لاانتہا سلسلہ
اپنے چہرے چہرے پر پران سات رنگوں کی
بے رنگ ہی یہ نقاب اوڑھ کر، ایسی یک رنگی زندگی،
موسموں کے بدلتے تناظر میں کب تک چھپائے گا۔

مرے گناہ سبھی

یہ دعائیں آپ کی ہیں بدعائیں میری ہیں
جفا میں آپ کا حق ہے وفا میں میری ہیں
خلوص و دوستی اور اعتماد و پاسِ قرار
یہ لغزشیں ہیں مری یہ خطائیں میری ہیں
صلیب و زہر روا ہوں یا سنگساری ہو
یقین کرو کہ یہ ساری سزا میں میری ہیں
ہر ایک سانس مری لائق سزا ٹھہری
ہر ایک بات مری قابل دست اندازی
طویل تر ہوئی جاتی ہے فرد جرم مری
شکست و ریخت معانی ہو یا زبان سازی
وضاحتوں میں گئی عمر آیا یوم حساب
میں کب نہیں تھا جواب کے ہوا ہوں زیر عتاب
جو آفتاب لب بام ہے تو ہو جائے
جو شب گرفتہ فلک کا نظام ہو جائے

تو حرف گیروں کو اک اذن عام ہو جائے

کہاں سے لوح کروں اور کہاں سے موئے قلم
شریک جرم نہیں کوئی ہم نگاہ نہیں
میرے مدار میں حائل کسی کی راہ نہیں

نظر میں پاس رہے دل میں پیاس رہنے دو
کہیں کسی کو قرین قیاس رہنے دو
میں ایک ذرہ زمیں بستہ ہوں کہاں جاؤں
مجھے یہیں پہ کہیں آس پاس رہنے دو
کوئی نہ نے مرے الزام اپنے سر بلراج
مرے گناہ بھی میرے پاس رہنے دو

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

مجبوری

براہ راست جو اترے تھے آسماں سے حروف
جواز بن نہ سکے ترجمان بن نہ سکے
قنوطیت کا ہوں قائل نہ میں رجائی ہوں
پیام بر ہوں نہ مجھ پر ہوا ہے کوئی نزول
خود اپنی ذات سے پھینکا گیا تھا میں باہر
زمین پر ہوں زمیں سے تعلقات نہیں
بھٹک رہا ہوں میں بے رشتگی کے صحرا میں
یہ اعتزال ہے بس میرے کرب کا مخرج
یہ بازیافت ہے میری اذیتوں کا سبب
اس احتجاج پر مجھ کو کیا گیا مصلوب
مجھے بھی کوئی مقدس کتاب دے جاؤ
یہ آگہی کا مسلسل عذاب لے جاؤ

سفر

ابھی ہیں پاؤں میں لکھی مسافتیں کتنی
ندامتیں ابھی کتنی ہیں راحتیں کتنی
ابھی گرفت میں آئی ہیں وسعتیں کتنی
ابھی تو وقت میں پنہاں ہیں وحشتیں کتنی
نشیب کتنے ہیں کتنے فراز باقی ہیں
ابھی تو وقت کے سینے میں راز باقی ہیں
ابھی تو ایک ہی ذرے میں ہم اتر نہ سکے
ابھی تو موت کی سرحد سے بھی گزر نہ سکے
قدم اٹھاؤ کہ یہ رقص ناتمام چلے
مناؤ جشن زمینیں ہیں مہربان ابھی
صدائیں دے کے بلاتے ہیں آسمان ابھی
کہاں رکیں گے کہ بستی میں بے حدودی ہے
سفر سفر ہے کہ افقی ہے یا عمودی ہے

قوس

وہی ہیں درد، وہی غم، مسرتیں ہیں وہی
وہی فراق کی دوری ہے قربتیں ہیں وہی
محبتیں ہیں وہی اور یہ اور تہمتیں ہیں وہی
جنون عشق کے اعزاز و نعمتیں ہیں وہی

وہی ہیں خوف، وہی ڈر ہیں، وحشتیں ہیں وہی
حقیقتیں بھی وہی ہیں صداقتیں ہیں وہی
تعلقات بھی ویسے، عداوتیں ہیں وہی
نشیب بھی ہیں وہی اور رفعتیں ہیں وہی

جمود بھی ہے وہی اور وسعتیں ہیں وہی
وہی ہے لہو ولعب، ناؤ نوش، ہاؤ ہو
وہی قدیم مشاغل ہیں، فرصتیں ہیں وہی
کہانیاں بھی وہی ہیں کہاوتیں بھی وہی

کہ حرف و لفظ و بیاں کی نزاکتیں ہیں وہی
وہی زمیں ہے، وہی آسماں، جہاں ہے وہی

کرائے دار بدل جاتے ہیں مکاں ہے وہی
گھڑے گھڑائے وہی واقعے فسانے میں
بہ جز مرے تو نیا کچھ نہیں زمانے میں

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

تبصرے

نام کتاب: آسانیات
مصنف: بلراج بخشی
ضخامت: ۳۱۰ صفحات
قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: اوشین پبلشنگ ہاؤس اُدھم پور (جموں کشمیر)
مبصر: ڈاکٹر وصی بختیاری (آندھرا پردیش)

بلراج بخشی، دراصل ان شاندار ادبی روایات کا تسلسل ہیں، جنہوں نے وادیٔ جموں وکشمیر میں اردو ادب کی شاندار اور روشن خدمات کے ذریعہ ایک تاریخ رقم کی ہے۔ ان کی ادبی خدمات اور متنوع ہمہ جہات ہیں۔ وہ ایک شاعر، افسانہ نگار، محقق، نقاد، صحافی، ماہرِ لسانیات اور ایک لغت نویس بھی تھے۔

بلراج بخشی کی کتاب 'آسانیات' کی دو جلدیں دستیاب ہیں، جن سے یہ اشتباہ اور التباس پیدا ہو جاتا ہے کہ بلراج بخشی کا یہ وقیع کام 'لغت نویسی اور اردو کے اسماء و افعال پر مشتمل تھیسارس' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ فی الواقع ایک ہی کتاب کے دو ایڈیشن مارکیٹ میں موجود ہیں۔ آسانیات کا پہلا ایڈیشن 2020 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومتِ ہند کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن 2021 میں شائع ہوا۔ خود مصنف نے اپنی ایماء سے اس پر 'آسانیات-2' درج کروایا۔ دو جلدوں پر مشتمل 'آسانیات' بلاشبہ ان کا ایک وقیع کارنامہ ہے۔ بہ الفاظِ دیگر 'آسانیات' معروف معنوں میں تھیسارس ہی کی ایک ایسی شکل ہے، جس کے ذریعہ ہم کسی لفظ کا معنی تلاش کرنے کے بجائے مطلوبہ موضوعات اور تصورات کے بارے میں الفاظ کی مناسب فہرستیں اور الفاظ اور ان کے مترادفات، ہم معنی و قریب المعنی لفظیات حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا عام لغت کی طرح الفبائی ترتیب میں لفظوں کا معنی و مطلب درج کرنے کے بجائے تھیسارس کی ایک شکل 'آسانیات' مختلف موضوعات اور تصورات کے بارے میں مناسب الفاظ یکجا دستیاب کر دیتی ہے۔

بلراج بخشی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس طرح ادارہ جاتی سطح پر نہیں، بلکہ تن تنہا یہ کارنامہ انجام دیا ہے اور اس کے لیے انہیں کہیں سے کوئی مالی امداد یا کوئی سرکاری سرپرستی حاصل نہ رہی۔ بلراج بخشی 'آسانیات' کے مقدمہ میں، اپنی کاوش کا تعارف کرواتے ہوئے غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خیالات کے اظہار میں مناسب الفاظ کے نہ مل پانے پر اکثر مترادفات سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ لیکن دشواری افعال یا اسما کے سلسلے میں آتی ہے جن کے مترادفات یا مرادفات شاذ ہی ہوتے ہیں اور جب تک مخصوص مطلوبہ لفظ نہ ملے، سلسلۂ اظہار آگے نہیں بڑھ سکتا۔ حالانکہ وہ لفظ لغت میں موجود ہوگا لیکن اس کے لیے لغت نوردی نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا 'افعال و اسما کے اس مجموعے کی ترتیب کا یہی محرک تھا کہ مطلوبہ لفظ بہ آسانی مل جائے۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ مختلف موضوعات سے متعلق الفاظ کو الگ الگ عنوانوں کے تحت پیش کیا جائے تا کہ اس موضوع سے متعلق لفظ کے لیے تمام کتاب کو چھاننے کے بجائے اسی عنوان میں دیکھ لیا جائے۔ لیکن تمام الفاظ کی عنوان سازی بھی ممکن نہیں، لہٰذا بہت سارے الفاظ حروفِ تہجی کی ترتیب سے بھی دیے گئے ہیں۔" (میری بات، آسانیات)

بلراج بخشی نے اپنے مقدمہ میں جدید انگریزی اصلاحات اور ان کے اردو مترادفات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ جدید سائنسی ایجادات، نئی تعبیرات اور نئی اصطلاحات کے لیے متبادل الفاظ اور اردو اصطلاح سازی کا عمل رک گیا ہے۔ اس سلسلے میں اگر پیش رفت ہوئی بھی ہے تو وہ قابلِ قبول نہیں ہے بلکہ کسی حد تک مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ بلراج بخشی نے اس پہلو پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور کئی الفاظ اور ان کے لیے تجویز کردہ متبادل اصطلاحات پیش کر کے یہ عندیہ دینا چاہا ہے کہ بیشتر جدید اصطلاحات کو معروف اور متبادل معنوں میں، انگریزی الفاظ ہی کو اردو میں رواج دیا جا چکا ہے، لہٰذا اس سلسلے میں قبول کرنے ہی میں عافیت ہے۔ یہاں ہمیں بلراج بخشی کی تجویز قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ فی زمانہ بالعموم اردو میں اصطلاح سازی کا عمل گویا ایک طرح سے موقوف ہو چکا ہے اور ہماری زبان اردو کے دامن کی بے پناہ وسعت اس کی متحمل بھی ہے کہ جدید لفظیات اور انگریزی کے متبادل اصطلاحی الفاظ کو بہو اختیار کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں بلراج بخشی لکھتے ہیں:

"گزشتہ برسوں میں سائنس اور تکنالوجی سمیت کئی شعبوں میں بے پناہ ترقی سے نئی اصطلاحیں اور نئے الفاظ معرضِ وجود میں آئے ہیں، جن کے اردو مماثلات و مترادفات نہ کے برابر ہیں اور یہ اس لیے ہے کہ

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

سائینس اور تکنالوجی کی افزونی میں برصغیر کے معاشروں نے کوئی حصہ نہیں ڈالا۔ حال ہی میں انہوں نے موبائل بنایا، اس میں ایک کیمرا لگایا، پھر کچھ عرصہ بعد اس میں دوسرا کیمرا بھی الگا دیا۔ اب آپ اپنے موبائل کیمرے سے خود اپنی تصویر بھی کھینچ سکتے ہیں۔ خود کھینچی گئی اپنی تصویر کو انہوں نے سیلفی (selfie) کہا۔ اب آپ بھی اسے 'سیلفی' کہنے پر مجبور ہیں کیونکہ اس کا ترجمہ برصغیر کی کسی زبان میں نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ اصطلاحیں گھڑنے کے لیے ہم نے باقاعدہ کمیٹیاں بنا رکھی ہیں، جنہیں باقاعدگی سے خطیر رقوم تفویض کی جاتی ہیں اور وہ ان پیسوں سے تفننِ طبع کے لئے مضحکہ خیز اصطلاحیں گھڑتے رہتے ہیں...... میں نے استعمال عام میں آنے والے اسما و افعال کی فہرست بندی اور مترادفات و مرادفات تلاش کرنے کی سعی کی ہے لیکن ابھی اس میں بہتری کے کئی امکانات ہیں۔ یہ بہرحال اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔ امید ہے قلمکاروں کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ (بلراج بخشی)

آسانیات کی فہرست سے ان کی محنت اور کاوش کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس میں انہوں نے موضوعات کی فہرست کو بھی الفبائی ترتیب سے شامل کتاب کردیا ہے۔ اس فہرست میں تقریباً 45 کلیدی موضوعات کے تحت اردو کے اسما و افعال کو یکجا کردیا ہے، جس میں متفرقات بھی شامل ہیں۔ آسانیات کی فہرست میں' آرائش سے متعلق، آوازوں سے متعلق، اعتقاد و یقین، اوزاروں، آلات و مشینوں، بازار و باورچی خانہ، کھانے اور برتنوں سے متعلق، رقص و موسیقی اور رنگوں کے علاوہ اسی طرح اس فہرست میں' قانون، زبان و بیان اور زیورات وغیرہ بھی شامل ہیں۔

آسانیات میں ہزاروں الفاظ شامل ہیں۔ اس کاوش کی اہمیت اس وجہ سے دوبالا ہو جاتی ہے کہ یہ فردِ واحد کا انفرادی کام ہے۔ اس کام کو بلراج بخشی نے تن تنہا انجام دیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے مقدمہ 'اپنی بات' میں نہایت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ''میں نے استعمالِ عام میں آنے والے اسماء وافعال کی فہرست بندی اور مترادفات تلاش کرنے کی سعی کی ہے لیکن ابھی اس میں بہتری کے کئی امکانات ہیں اور پھر یہ تو ایک مسلسل عمل ہے۔ بہر حال اپنی قسم کی یہ پہلی کوشش، اُمید ہے قلمکاروں کے لیے مفید ثابت ہوگی۔''
غالباً اندازہ یہی ہے کہ ایک ذہین اور محنتی لغت نویس نے اپنے نقشِ ثانی میں یقیناً ترمیمات، اصلاحات اور اضافے کیے ہوں گے۔

نام کتاب: ایک بوند زندگی
مصنف: بلراج بخشی
ضخامت: ۱۵۸ صفحات
قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: اوشین پبلشنگ ہاوس ادہم پور (جموں کشمیر)
مبصر: ڈاکٹر جگ موہن سنگھ (جموں)

بلراج بخشی عصرِ حاضر کا ایک ایسا تخلیق کار ہے، جس کی تخلیقات کے ہر قطرے میں اپنے سامنے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے زندگی اور زمانے کا سمندر مختلف زاویوں سے بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ 'ایک بوند زندگی' میں عصری زندگی کی کروٹوں کو سمیٹ لینا آسان نہیں لیکن فنکاری کا یہی وہ اعلیٰ مقام ہے جہاں پر فنکار سب کے ساتھ شامل ہونے کے باوجود سب سے منفرد دکھائی دیتا ہے۔ ہم بلراج بخشی کو شاعر، صحافی، محقق اور نقاد کے علاوہ افسانہ نگار کی حیثیت سے خاص طور پر جانتے ہیں۔

'ایک بوند زندگی' بلراج بخشی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں بارہ افسانہ شامل ہیں۔ اس مجموعے میں سادہ، علامتی اور استعاراتی ہر طرح کے اُسلوب میں افسانے ملتے ہیں۔ زیرِ بحث کتاب میں بعض افسانے سیدھی سادی زندگی کے واقعات اور کرداروں کو ذہن میں رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب میں شامل بلراج بخشی کا پہلا افسانہ 'فیصلہ' سادہ بیانیہ میں لکھا گیا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ جموں و کشمیر کے علاقہ وادیٔ چناب کے سماجی اور ثقافتی پس منظر میں لکھا گیا یہ افسانہ ڈوڈہ، کشتواڑ اور رام بن جیسے پہاڑی علاقوں کی روایات اور اقدار کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور اس علاقہ کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بلراج بخشی نے اس علاقہ میں ملی ٹینسی اور سکیورٹی فورسز کی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

زیرِ بحث کتاب میں شامل دوسرا افسانہ 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' میں بلراج بخشی نے موجودہ نظام کی ناکارکردگی کو نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ بلراج بخشی نے اس افسانہ میں بالواسطہ طور پر اشاراتی انداز میں موجودہ انتظامی نظام کو بدلنے کی حمایت کی ہے کیونکہ اس نظام کے اندرون لوگوں کے مسائل حل نہیں ہوتے ہیں بلکہ ہر مسئلہ سے کئی مسئلے پیدا کر دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح 'مشترکہ اعلامیہ' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں بلراج بخشی نے انسان اور انسانیت کے حقوق کی پامالی اور بین الاقوامی اداروں کی بے حسی سے پردہ اُٹھایا ہے۔ اس افسانے کو ایک سیاسی افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے

حوالے سے ریاست جموں کشمیر ایک بہت ہی حساس علاقہ ہے۔ دونوں ملکوں میں جنگی قیدیوں اور راستہ بھٹک کر ایک دوسرے کی سرزمین میں قید ہو جانے والے لوگوں کی کہانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دونوں ملکوں میں عام طور پر ایسے لاپتہ لوگوں اور سرحدی قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد جیلوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ بلراج بخشی نے افسانہ میں جموں کشمیر کے اس حساس مسئلہ کو بڑی ہی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سویزرلینڈ (جنیوا) بین الاقوامی انسانی حقوق کمیشن کا صدر مقام ہے جہاں اکثر ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے آپس میں ملتے رہتے ہیں۔ چنانچہ پاکستانی نمائندہ نصرت یار خان اور ہندوستانی نمائندہ راوٗرتن سنگھ دونوں یہ مانتے ہیں کہ:

''ہمارے دونوں ممالک میں پچھلے پچاس برسوں سے کئی ایسے گھرانے سامنے آئے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان کا کوئی نہ کوئی عزیز دوسرے ملک کی کسی جیل میں بند ہے۔ ان گمشدہ لوگوں میں جنگی قیدیوں اور سرحد پر راستہ بھٹک جانے والوں کا نام لیا جاتا ہے۔ دونوں ملکوں نے کئی بار سرکاری طور پر نہ صرف قیدیوں کی فہرستوں کا، بلکہ تا قیدیوں کا بھی تبادلہ کیا ہے جو کسی وجہ سے دونوں ممالک کی جیلوں میں تھے۔'' (ص 75)

بلراج بخشی نے اس افسانہ 'مشترکہ اعلامیہ' میں بعض سنگین حقائق کی طرف شائع بھی کیا ہے۔

''دونوں ممالک میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں ہوئی ہیں۔ دونوں ملکوں میں بلا ضرورت محض کسی وحشی لذت کے حصول کے لیے بے بس قیدیوں پر تشدد کی انتہا کی گئی ہے۔ جن کی حالت دیکھ کر ازمنہ وسطیٰ کے عقوبت خانوں کی یاد آجاتی ہے۔ جس کے لیے یقیناً انسانیت کا سر شرم سے جھک جانا چاہیے۔ لیکن جو بھی ہوا اس پر اظہار افسوس کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی ان لوگوں کے خلاف کوئی کاروائی کی جاسکتی ہے جن کی اجازت سے یہ سب ہوا۔ (ص 79)

بلراج بخشی یہ تاثر دیتے ہیں کہ قیدیوں کا مسئلہ ہو یا سرحدی خلاف ورزی کرنے والوں کا دونوں علاقوں کے نمائندے اکثر معاملات کو دبا دینے پر ہی یقین کرتے ہیں۔ چنانچہ قیدیوں کے مسئلے پر غور و فکر اور بحث و مباحثہ کے بعد جو مشترکہ اعلامیہ جاری ہوتا ہے۔ اس میں دونوں ممالک کے نمائندے راوٗ رتن سنگھ اور نصرت یار خان قیدیوں کی رہائی اور تبادلہ کے حوالے سے اطمینان کا اظہار کرتے ہیں اور پھر Switerzerland کی سیر و تفریح میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے یہ افسانہ انسان اور انسانیت کے حوالے سے نام نہاد عالمی اداروں پر طنز کی حیثیت رکھتا ہے۔

بلراج بخشی کا افسانہ 'مکتی' ایک لاعلاج بیماری Neuronal Ceroid Lipofuscinoses کے موضوع پر لکھا گیا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں جدید دور کی عورت کی نئی سوچ اور مذہبی استحکام پر یقین رکھنے والی عورتوں کی سوچ و فکر کے تضادات اور کشمکش کو پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ سائنس فکشن نہیں ہے لیکن اس میں ذہنی بیماری کے حوالے سے جن بائیولوجیکل (میڈیکل) اصطلاحات کا استعمال کیا ہے وہ اس افسانے کو ایک (biological) حیاتیاتی افسانہ بناتی ہیں۔ مابعد جدید دور میں انسانی ذہن کی الجھنوں نفسیاتی پیچیدگیوں کی ایک وجہ انسان کی رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی آلودگی (خرابی) بھی ہے۔ جس کے کئی پراسرار اسباب ہوتے ہیں۔

افسانہ 'مکتی' میں بلراج بخشی نے کئی انگریزی اصطلاحات مثلاً: genetic mutation, genes, kufs disease lipofuscinoses, Enzyme, MRI, Lippo, neurons, وغیرہ کا استعمال کیا ہے اور اس افسانے کے مرکزی کردار یعنی بیمار بچے کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''بچوں میں لاعلاج وراثتی بیماریوں کا ایک گروپ ہے جسے Neuronal Ceroid Lipofuscinoses یا مختصراً NCL کہا جاتا ہے......اس گروپ کی مختلف بیماریوں کی علامتیں چھ سے بارہ مہینوں کی عمر...... دو سے چار سال کی عمر یا پھر چار سے نو سال کی عمر تک ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ اور بیماری کی نشانیاں ہیں...... ارادے اور اعضا کی حرکت میں تال میل نہ ہونا...... شناخت کی قابلیت اور دماغ کا develop نہ ہونا...... بینائی کا loss مرگی جیسے دورے اور پھر...... آخر میں موت...... وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔'' (صفحہ نمبر ۸۲)

دراصل کئی نا معلوم بیماریوں کی وجہ سے بچے میں ایک نئے قسم کی جینیٹک میوٹیشن (mutationgenetic) پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ فطری طور پر بچے کی ماں اپنے بیٹے کے علاج کی جانب سے مایوس ہو کر مذہبی روحانی علاج کا سہارا لیتی ہے۔ یہ روایت پورے ملک میں عام بھی ہے۔ مذہب مایوسیوں سے الگ جینے کا ایک سہارا ہے لیکن یہ سہارا اس وقت میں

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

کہیں نہیں ملتا ہے۔ میناکشی بھی اپنے بیٹے کی بیماری دور کرنے کے لیے ایک پنڈت کا سہارا لیتی ہے لیکن یہ پنڈت کسی روحانی طاقت کا حامل تھا یا نہیں یہ ایک مشکوک معاملہ تھا۔

افسانہ کے آخر میں بیمار بچہ اروند خاموش ہو جاتا ہے مناکشی پچھاڑے کھا رہی اور سداونتی جلد سماجی لے لیتی ہے چندر گرہن ختم ہو جاتا ہے لیکن بیمار بچے اروند کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی شاید اسے مکتی مل گئی ہے اس افسانہ کا اختتام تجزیہ لب و لہجہ میں بڑے ہی دردناک منظر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے:

''سروج بڑی دیر تک اپنی ساس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اس نے سر کو ہلکی سی تفہیمی جنبش دی اور سیتاونتی کی کلائی پر اس کے ہاتھ کی گرفت بتدریج ڈھیلی ہوتی گئی۔ سیتاونتی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور پانی اس کے سینے تک آ گیا۔ اروند بدستور سویا ہوا تھا۔ 'نہیں یں یں یں۔۔۔' میناکشی پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی آگے جھپٹی لیکن سروج نے مضبوطی سے میناکشی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ سیتاونتی نے میناکشی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ایک جھٹکے سے مڑ کر قدم آگے بڑھایا اور اچانک نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ عین اسی وقت آس پاس کے تمام مندروں سے گھنٹیوں، چھینوں، چمٹوں، کھڑتالوں اور شنکھوں کی آوازیں آنے لگیں اور فضا ہری اوم .. ہری اوم ... ہری اوم ... کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ چندر گرہن ختم ہو گیا۔ میناکشی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔'' (صفحہ نمبر ۸۹/۹۰)

حقیقی زندگی میں بلراج بخشی کا مذہب انسان اور انسان پرستی تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں انسان اور انسانی قدروں کا احترام ہر جگہ ملتا ہے۔ 'ایک بوند زندگی' کا ہر افسانہ تفصیلی تبصرہ اور تجزیہ کا مطالبہ کرتا ہے لیکن کہیں شاہکار افسانوں میں ایک غیر معمولی افسانہ 'زچ' بھی ہے۔ یہ افسانہ عورت اور مرد کی قوت تولید کے موضوع پر ہے۔ افسانہ میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح بعض عورتیں بانجھ ہوتی ہیں اسی طرح بعض مردوں میں مادۂ تولید نہیں ہوتی۔ 'زچ' ایک ایسا ہی نفسیاتی افسانہ ہے جس میں مرد (ساحل) مادۂ تولید سے محروم ہے لیکن اس کی بیوی نیلم بچہ چاہتی ہے اور آخر کار وہ artificial insemination کو کروا کر بچہ پیدا کرتی ہے۔ میاں بیوی دونوں خوش تو ہوتے ہیں لیکن دونوں کے ذہنوں میں ایک گرہ سی بندھ جاتی ہیں۔ جس سے دونوں شرمندہ تو ہوتے ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے۔ عورتوں اور مردوں کی شادی شدہ زندگی میں شرمندگی کے ایسے کئی موقع آتے ہیں جن سے کبھی کوئی فائدہ بھی اُٹھاتا ہے اور کبھی جانے انجانے میں اس سے نقصان بھی ہوتا ہے۔ اس افسانہ کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بلراج بخشی نے اُردو کے مشہور افسانہ نگاروں منٹو، بیدی، قدرت اللہ شہاب وغیرہ کے بعد کے عصری نفسیاتی مسائل کو اس افسانہ میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

دراصل بلراج بخشی کے افسانے زندگی اور زمانہ کے ایسے ہی دیدہ و نادیدہ موضوعات کو سمیٹتے ہیں اور انھیں وہ اپنے افسانوں میں پوری فنی اور تخلیقی خوبیوں اور مہارت کے ساتھ بھی پیش کرتے ہیں کہ ایک بوند میں زندگی کی ساری کائنات سمٹ آتی ہے۔ بلراج بخشی کے افسانوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں ان کا کوئی افسانہ تحریر کی شکل میں ختم ہوتا ہے وہاں ہی احساس اور کیفیت کی سطح پر افسانے کی ایک نئی شروعات ہوتی ہے اور یہی بلراج بخشی کی افسانہ نگاری کا امتیاز ہے۔

نام کتاب: مٹی کے موسم
شاعر: بلراج بخشی
ضخامت: 202 صفحات
ناشر: اوشین پبلشنگ ہاوس ادہم پور (جموں کشمیر)
مبصر: ڈاکٹر جگ موہن سنگھ

بلراج بخشی اُردو کے ایک جانے مانے شاعر، افسانہ نگار، محقق اور نقاد ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصنیف (شعری مجموعہ) 'مٹی کے موسم' کے نام سے 2021ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ زیر بحث کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلراج بخشی کی شاعری کسی خاص رجحان یا نظریہ تک محدود نہیں ہے۔ ''مٹی کے موسم'' میں شامل غزلیں اور نظمیں اُردو غزل و نظم کے ہر موسم کا ساتھ نبھاتی نظر آتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، ان کے یہاں کلاسیکیت بھی ہے، ترقی پسندی بھی اور جدید و مابعد جدید ادبی تصورات کے سائے بھی۔ جس کا اندازہ اس کتاب میں شامل درج ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

رقیب ہو گیا میرا ہی پیرہن آخر
نہ آشکار ہوا مجھ پہ وہ بدن آخر

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

اب وہ پہلے سے مراسم تو نہیں ہیں لیکن
جہاں جاتا ہوں میں اکثر وہ وہیں ہوتا ہے

میں بھی کہہ سکتا ہوں بلراج فسانہ اپنا
پاسداری ہے روایت کی جو خاموش رہوں

میرے ہاتھوں کی لکیروں سے نکل کر آئے
وہ اگر میرا مقدر ہے تو چل کر آئے

ماضی وحال کے ہر غم سے سبکدوش رہوں
ہوش میں آنے سے بہتر ہے کہ بے ہوش رہوں

’مٹی کے موسم‘ میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ چھوٹی اور بڑی ہر طرح کی بحر میں غزلیں ملتی ہیں۔ زبان و بیان پر بے پناہ قدرت کے سبب بلراج بخشی کے شعر میں معنی کے علاوہ کیفیت اور تاثر کے بھی دائرے بنتے ہیں۔ بلراج بخشی یہ جانتے ہیں کہ کس طرح کے موضوع کے لیے کیسے الفاظ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس لیے کتاب میں شامل غزلوں میں اور نظموں میں موضوعاتی تنوع بھی ہے اور اسلوبیاتی انفرادیت بھی۔ بلراج بخشی نے اپنی نظموں میں عصری مسائل کو علامتی اور استعاراتی اسلوب میں پیش کیا ہے۔

زیر بحث کتاب ’مٹی کے موسم‘ میں غزلوں کی طرح نظموں میں بھی انفرادیت ہے۔ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ان کی ایک نظم ’قرض‘ بے حد اہم ہے۔ جس میں انھوں نے آج کے انسان کو اپنے اجداد کے اعمال کا قرض دار بتایا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ اپنے آبا و اجداد کے نقش قدم پر چل کر ہی ہم اپنی آئندہ نسلوں کے لیے کوئی روشن راہ کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

بلراج بخشی کی ایک نظم ’میرے گناہ سبھی‘ پابند نظم کی عمدہ مثال ہے۔ لیکن اس نے نظم میں غزل کا انداز بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ نظم کے یہ چار مصرع قابل توجہ ہیں:

دعائیں آپ کی ہیں بد دعائیں میری ہیں
جفائیں آپ کا حق ہے وفائیں میری ہیں
خلوص و دوستی اور اعتماد و پاس قرار
یہ لغزشیں ہیں مری یہ خطائیں میری ہیں

بلراج بخشی کی نظم ’مٹی کے موسم‘ کا موضوع زندگی کی یکسانیت سے اکتاہٹ اور بیزاری سے عبارت ہے۔ موسم کا استعارہ انھوں نے اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ اس دائرے میں سماجی اور سیاسی ہر طرح کی تبدیلیاں سمٹ آئی ہیں۔ موسم کے بدلنے سے انسان کے حالات نہیں بدلتے۔ اسی لیے بلراج بخشی یہ کہتے ہیں کہ وقت کوشش کے باوجود اپنی بے رنگی کو چھپا نہیں پائے گا اور ایک وقت آئے گا جب انسان موسموں کی لایعنیت کا شعور حاصل کر لے گا۔ اس نظم کے آخر کے ان مصرعوں پر غور کریں کہ صاحب کتاب کیا کہنا چاہتے ہیں، اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

بدلتے ہوئے موسموں سے میری التجا ہے
اگر ہو سکے تو مرے گھر کے آنگن میں
ہر روز ایسی شعائیں اتاریں
جو پہلے کی ساری شعاؤں سے ہوں مختلف اور نئی،
میری آنکھوں میں بھر دیں نئے رنگ جو سات رنگوں
کی فہرست میں بھی نہ ہوں
رات دن کا یہ لاانتہا سلسلہ

اپنے چہرے پہ
ان سات رنگوں کی
بے رنگ سی یہ نقاب اوڑھ کر،
ایسی یک رنگئی زندگی،
موسموں کے بدلتے تناظر میں
کب تک چھپائے گا۔

یہ مختصر سا تبصرہ بلراج بخشی کی کتاب ’مٹی کے موسم‘ کی خوبیوں کا احاطہ نہیں کرتا لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آ کر جن گنے چنے شاعروں کی غزلیں اور نظمیں اُردو شاعری کے لیے سرمایہ ثابت ہوں گئیں۔ ان میں سے ایک بلراج بخشی بھی ہے۔ بحیثیت مجموعی بلراج بخشی کا یہ شعری مجموعہ ’مٹی کے موسم‘ بحیثیت شاعر اُن کا مقام و مرتبہ قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

مشاہیرادب کے تاثرات

بلراج بخشی کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ 'فیصلہ'، 'زچ'، 'ڈیتھ سرٹفکیٹ' اور 'چور' کو اُردو کی بہترین کہانیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ زبان وبیان پر بلراج بخشی کے مکمل عبور سے ایک خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں الفاظ کا دروبست برمحل ہے۔ (اقبال مجید، اُتر پردیش)

بلراج بخشی معاشرے کی خامیوں اور برائیوں کی تصویر کشی کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں تلخی بھی ہے اور ترشی بھی اور وہ اپنے طنز سے اپنی تحریروں کو بہت ہی دلکش اور دل پذیر بنادیتے ہیں۔ ان کے جملوں کا طنز نشتر کی سی کاٹ رکھتا ہے اور کئی جملے تو یادداشت کا حصہ بن کررہ جاتے ہیں وہ ملک کے موجودہ سیاسی اور سماجی صورت حال اور عوام کے مصائب کو بڑے دلپذیر پیرائے میں بیان کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور ان کی تحریروں میں معاشرتی اور سیاسی سطح پر ارتقائی عمل بھی جھلکتا ہے۔ ان کی کئی کہانیوں کی مضبوط گرفت قاری پر اپنا گہرا تاثر چھوڑتی ہے جو افسانہ نگار کی کامیابی کی نشانی ہے۔ (نندکشور وکرم، نئی دہلی)

بلراج بخشی کی مضبوط ومربوط شاعرانہ منطق شعر کے مرکز خیال کو عقلی یا جذباتی پس منظر میں لطف انگیزی کا حامل بنا دیتی ہے۔ ان کا شعر اپنی اسلوبی مفاہمت کے باعث تحلیل کو انبساط پر مرکوز رکھنے پر قادر ہے۔ بلراج بخشی کے کتنے ہی الفاظ اور ترکیبیں ایسی ہیں جو تازہ عصری حسیت کے مرکزی دائرہ انعکاس میں موجود ہیں۔ ان کا حیرت انگیز فلسفیانہ انداز فکر اور انوکھا مگر پراثر اظہار ان کی شاعری میں جھلکتا اور چھلکتا نظر آتا ہے۔ ان کی جدت طرازی کا حسن محض زبان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ اپنے خیالات اور طرز عمل سے بھی اسے بصری، سمعی اور حسی پیکر عطا کرتے ہیں۔

(کرشن کمار طور، دھرم شالہ، ہماچل پردیش)

بعض ادبی شخصیات کے اندر متنوع خوبیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ کبھی وہ اپنی خوبیوں کا بہاؤ شاعری کی طرف موڑ دیتے ہیں تو کبھی نثر نگار بن کر ان خوبیوں کی نمائش کرتے ہیں۔ صحافت ہو یا اداراتی زمہ داریاں اُنھیں ڈھنگ سے نبھانا آتی ہیں۔ ان شخصیات میں بلراج بخشی بھی شامل ہیں۔ ایک اچھے شاعر جن کی شاعری میں زبان کی مٹھاس اور بیان کی خوبیاں موجود ہیں، ایک اچھے نثر نگار جو افسانہ لکھنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔

(نور شاہ، سرینگر، جموں کشمیر)

بلراج بخشی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں اُن کی ادبی سنجیدگی پوشیدہ تھی، اِس کا احساس مجھے اکثر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کی نشستوں میں ہوا جہاں ہم دونوں موجود ہوتے تھے اور جموں کشمیر کی نمائندگی کرتے تھے۔ ویسے بھی اُن کی ادبی زندگی کے کئی رنگ تھے لیکن افسانوی ادب میں اُن کا اپنا ایک انداز تھا اور یہ انداز اُن کی مقبولیت کا سبب بھی بنا۔ وہ اپنے آس پاس کے حالات و واقعات افسانوی انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انسانی اقدار کی پامالی کے خلاف لکھتے تھے۔ جموں کشمیر کی صنف افسانہ میں وہ اپنی شرافت، سنجیدگی اور سلیقہ مندی کے تعلق سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے!! (وحشی سعید، سرینگر، جموں کشمیر)

بلراج بخشی کی شاعری موضوعی، لسانی اور فکری اعتبار سے عصری اُردو شاعری میں معنی، کیفیت اور تازہ کار افکار وخیالات کے لحاظ سے توجہ طلب ہے۔ ان کی غزلوں کے اشعار کلاسیکی ہی نہیں بلکہ جدید غزل کے مزاج کے ساتھ بھی مفاہمت سے زیادہ سرکشی کا رشتہ رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بلراج بخشی اپنی شرطوں کے ساتھ اُردو غزل کی مضبوط ومستحکم روایت کی زمین پر کھڑے ہیں۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی غزل کی شعریات کا التزام بھی واضح ہے۔ الفاظ کے لسانی برتاؤ، مضمون آفرینی، معنوی تہہ داری اور غزل کی داخلی ہیئت کی تازہ کاری کی بنا پر ان کی غزلوں میں ایک سرکش انفرادیت ہے۔ بلراج بخشی کی شاعری کے اندرون سے مرتعش لے اور موسیقی کا سازینہ ان کی غزلیہ شاعری کا وہ جلی دستخط ہے جس کے بغیر غزل محض انشائیہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ (پروفیسر قدوس جاوید، جموں، جموں کشمیر)

بلراج بخشی آج کے حالات اور آج کے انسانوں پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔ لیکن نگاہ کا نظریہ میں بدلنا، نظریہ کا فلسفہ اور فلسفہ کا فکشن میں ڈھل جانا ایک دشوار گذار اور نازک تخلیقی مرحلہ ہے۔ جس سے بلراج کامیابی سے گزر گئے ہیں اور قاری اس سے بھی آگے، کہانی کے بھی آگے ان احساسات وخیالات سے گذر جاتا ہے جو کہانی کے خاتمہ پر شروع ہوتے ہیں اور یہی ایک عمدہ کہانی کی کامیابی ہے کہ وہ جس مقام پر ختم ہو، اسی موڑ پر فکر وخیال کی ایک نئی دنیا شروع ہوتی ہو۔ (پروفیسر علی احمد فاطمی، الہ آباد، اُتر پردیش)

میں بلراج بخشی سے کبھی ملا تو نہیں البتہ میں انہیں ان کے افسانوں میں مستعمل گاڑھے بیانیہ (Dense Narrative) کے حوالے سے جانتا ہوں...... لیکن بلراج بخشی کے افسانوں کے

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

تانوں بانوں میں قاری کو کوئی سراغ نہیں ملتا اور وہ روانی میں بہے جاتا ہے لیکن افسانے کی آخری دو تین سطر میں اسے حیرت زا طمانیت بخش دیتی ہیں اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا انجام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پلاٹ پر بلراج بخشی کی اس قدر مضبوط گرفت قابل تحسین ہے۔(ڈاکٹر مولا بخش، دہلی)

بلراج بخشی کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا لیکن وہ بحیثیت افسانہ نگار زیادہ مقبول ہوئے۔ وہ اپنے محسوسات و جذبات اور مشاہدات و تجربات کو بہ حسن وخوبی پیش کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتے تھے۔ وہ معاشرے کے بڑے نباض تھے۔ فن شاعری ہو یا افسانہ نگاری موصوف نے دونوں صنف میں معاشرے کی منہ بولتی عکاسی کی ہے۔ پختہ کار ادیب و شاعر بلراج بخشی کی تخلیقات قارئین کو متاثر و مسحور کرتی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نہ بسیار نویس تھے اور نہ تخلیق کی اشاعت میں عجلت پسند۔ انھوں نے جس صنف کو چنا اس میں اپنی شناخت قائم کی۔ بلراج بخشی ایک شاعر، افسانہ نگار، مدیر و مترجم ہی نہیں بلکہ ایک دانشور بھی تھے۔ یہی خوبیاں بلراج بخشی کو ہم عصروں میں انفرادیت بخشتی ہیں۔ (پروفیسر شہاب عنایت ملک، جموں)

بلراج بخشی ایک ہمہ جہت اُردو قلم کار تھے۔ اُردو شاعری، افسانہ، تحقیق وتنقید کے علاوہ لسانیات اور صحافت سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا پوری ایمانداری اور غیر جانبداری سے لکھا، اسی لیے کچھ لوگ اُن سے خوش بھی تھے اور ناراض بھی لیکن ہر شخص اُن کی صلاحیتوں کا قائل تھا۔ شاعری اور افسانہ دونوں میں ان کی تخلیقیت جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے امتزاج کو پیش کرتی ہے۔ (چندر بھان خیال، دہلی)

بلراج بخشی میرے ہم عصر تھے۔ آنند لہر، بلراج بخشی اور میں اکثر اپنی تخلیقات ایک دوسرے کو سناتے اور تعمیری رائے کا احترام کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں مناسب رد و بدل بھی کرتے۔ وہ بہت اچھے شاعر تھے لیکن نثر میں بھی انھوں نے لاجواب لکھا اور ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ایک بوند زندگی' اس کا ثبوت ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع اور بیانیہ منفرد ہے۔ ان کی شاعری جدید اور کلاسکی روایات کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے اردو لفظیات پر بھی کام کیا۔ 'زبان و بیان' کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا جو مالی اور نامساعد حالات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اردو زبان و ادب کے ساتھ ان کی والہانہ محبت اور وابستگی مرتے دم تک رہی۔ (خالد حسین، جموں)

بلراج بخشی کی شاعری زندگی کی بے ثباتی، ستم ظریفی اور انسان کی بے بسی کے ساتھ ساتھ کسی اُفق سے طلوع ہوتی ہوئی آس کی شعاؤں کی بھی عکاس ہے۔ ان کی نظموں میں ایک اعلیٰ دانشورانہ سنجیدگی اور آشوب آگہی کا شعور ہے۔ ان کا شعری اسلوب پرکشش اور مستحکم بھی ہے اور اس کے باطن سے حیرت انگیز طور پر سکون بخش موسیقیت اور غنائیت کا اشاع بھی ہوتا ہے جو کہ معیاری شاعری کا اختصاص ہے۔ (پروفیسر کوثر مظہری، دہلی)

مجھے کہنے دیجیے۔ بلراج بخشی کے بیانیے میں کرشن چندر کے بیانیے کی روح رچی بسی ہے۔ وہی دلنواز انداز، وہی لوچ، وہی گھلاوٹ۔ ایسا طرز تحریر نہایت محنت و مشقت اور گہرے تجربے سے ہاتھ آتا ہے۔ کشمیر کی برف پوش پہاڑیاں اور رہگزار گویا آنکھوں کے سامنے زندہ اور متحرک ہو کر رقص کرنے لگے۔ افسوس کہ قلم کا ایسا دھنی وقت سے پہلے اس جہان آبادورنہ گل سے رخصت ہو گیا۔
(ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، دربھنگہ، بہار)

بلراج بخشی زندگی کو ہمیشہ عام لوگوں سے الگ ان زاویوں سے دیکھتے ہیں جو زاویے عام لوگوں کی نظر سے اُوجھل رہتے ہیں۔ ان کے افسانوں 'مکتی'، 'مشترکہ اعلانیہ'، 'زچ' اور 'ایک بوند زندگی' وغیرہ میں اس کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ افسانوں کی طرح اپنی شاعری میں بھی وہ مابعد جدید ثقافتی صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں۔ صحیح معنوں میں بلراج بخشی اپنے معاصرین میں ایک الگ اور منفرد خصوصیات کے حامل ہیں، کیونکہ جن تجربات اور مشاہدات کا بیان وہ اپنی تخلیقات میں کرتے ہیں وہ ان کی اپنی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں اور انھیں وہ پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی تحریروں میں بیان بھی کرتے ہیں۔ (پروفیسر روبینہ شبنم، مالیر کوٹلہ پنجاب)

بلراج بخشی ایک ہمہ گیر نابغہ (versatile genius) تھے۔ قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ انھیں پینٹنگ کا بھی شوق تھا اور یہ شوق دیوانگی کی حد تک تھا۔ وہ ایک بہترین آرٹسٹ تھے۔ اور کئی بار جب میں ان کے گھر جاتا تو وہ رنگ اور برش لے کر پینٹنگ بنا رہے ہوتے۔ وہ ایک محقق تھے، ناقد تھے، شاعر تھے، صحافی تھے۔ افسانہ نگار تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انگریزی میں بھی انھیں دسترس حاصل تھے۔ ہندی اور ڈوگری میں بھی انھوں نے بہت کام کیا۔ بحیثیت ترجمہ نگار بھی انھوں نے اپنی پہچان بنائی اور ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ڈوگری کتابوں کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ ان کے چند ڈوگری گیت ریڈیو اور دوردرشن پر بھی نشر ہوئے۔
(آنند سروپ انجم، جموں کشمیر)

☆☆☆

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

Quartly

ZUBAAN O BAYAAN, (Jammu Kashmir)

Vol: 1, Issue: 4

April 2025 to June 2025

Founder Editor:
Late Shri Balraj Bakshi

Patron:
Dr. Shreeya Bakshi

Editor:
Dr. Jug Mohan Singh

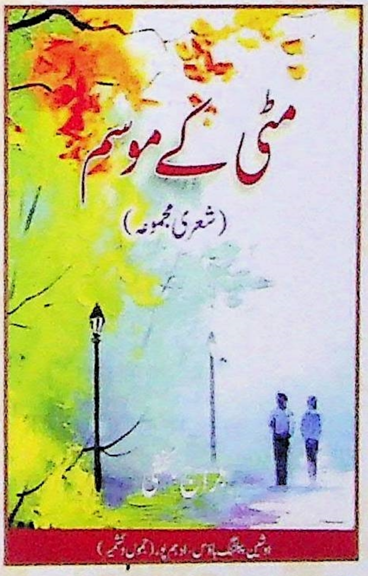

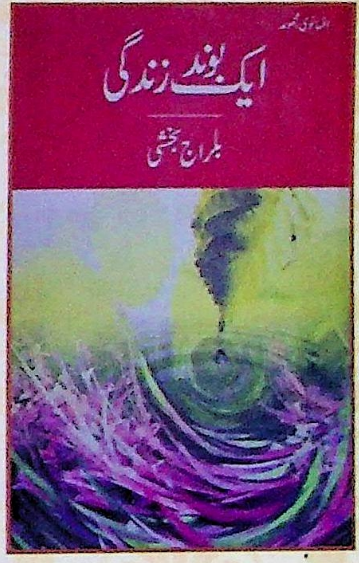

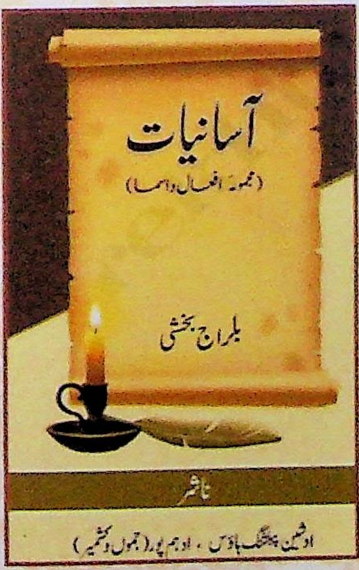

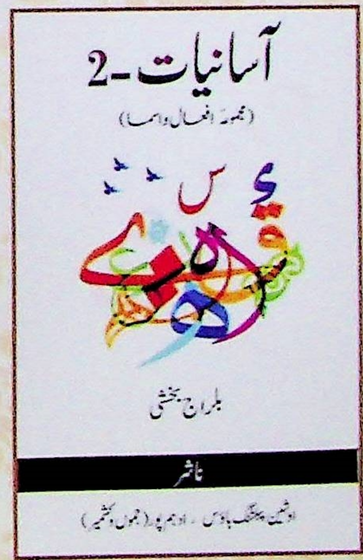

Kashmir Treasure Collection.Digitization by eGangotri

Quartly

ZUBAAN O BAYAAN, (Jammu Kashmir)

Vol: 1, Issue: 4

April 2025 to June 2025

Founder Editor:
Late Shri Balraj Bakshi

Patron:
Dr. Shreeya Bakshi
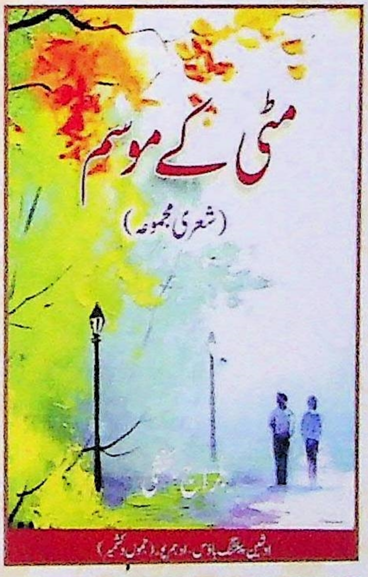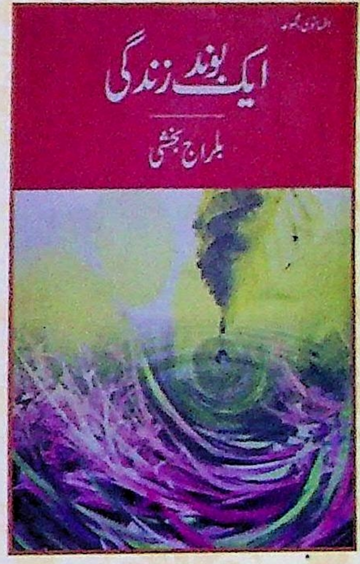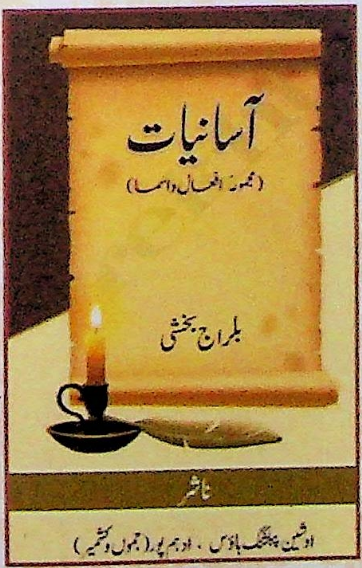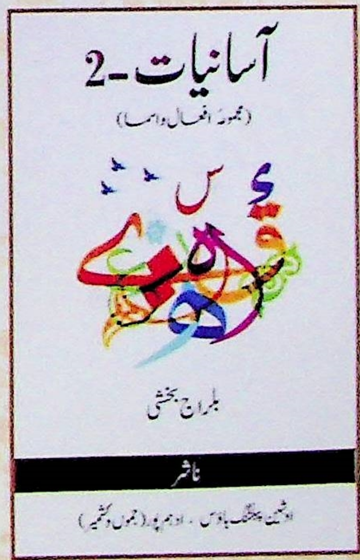
Editor:
Dr. Jug Mohan Singh